منہاج العرفان

فی

لفظ القرآن

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور
مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵/ایم ماڈل ٹاؤن

نام کتاب	مناہج العرفان فی لفظ القرآن
تصنیف	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
اشاعت اول	جنوری 1986ء
تعداد	4,000
اشاعت دوم	جولائی 1987ء
تعداد	2,000
اشاعت سوم	اکتوبر 1997ء
تعداد	گیارہ سو
کمپوزنگ	غلام نبی قادری
پروف ریڈنگ	عبدالستار
	حافظ محمد نفیس، عبدالستار
	منہاج القرآن پرنٹرز
	۴۸/روپے

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی کی تمام تصانیف اور خطابات و تقاریر کی ریکارڈ شدہ کیسٹس سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مرکزی تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔ (ناظم نشرواشاعت)

ISBN 969-32-0014-4

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مَوۡلَایَ صَلِّ وَسَلِّمۡ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِيۡبِكَ خَيۡرِ الۡخَلۡقِ كُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الۡكَوۡنَيۡنِ وَالثَّقَلَيۡنِ

وَالۡفَرِيۡقَيۡنِ مِنۡ عُرۡبٍ وَّمِنۡ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن اپنے نفس مضمون کے علاوہ عنوان کے اعتبار سے بھی تمام کتب وصحائف پر نمایاں فوقیت و امتیاز کا حامل ہے۔ علماء و مفسرین نے قرآن کے متعدد صفاتی اسماء بیان کئے ہیں جن کا ذکر بنیادی طور پر خود قرآن مجید کے مختلف مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں علامہ ابو المعالی اپنی کتاب "البرھان" میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مختلف خوبیوں اور خصائص کے پیش نظر اس کے پچپن (۵۵) نام بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً **الفرقان' الذکر' الکلام' الکتاب' النور' الهدیٰ' الشفاء' الموعظة' الحکمة البالغة' الرحمة' احسن الحدیث' التنزیل' التذکرۃ' العروۃ الوثقیٰ' البلاغ' الصحف القیمة' البیان** وغیرہا۔ یہ سب مترادفات ہیں جو قرآن حکیم کی گوناگوں خصوصیات کے پیش نظر اس میں موقع و محل کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں لیکن قرآن کا ذاتی نام جس سے اس مقدس کتاب کو تخصیص اور تشخص حاصل ہے۔ وہ "القرآن" ہے۔

اصطلاح قرآن کا الہامی ہونا

لفظ "قرآن" خود قرآن مجید میں کم و بیش ستر مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی اس کی انفرادیت اور امتیاز کا ایک پہلو ہے کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں وہ محرف و متبدل صورت میں جس قوم کے پاس بھی ہیں ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو اس وقت اپنے نام کی خود نشاندہی کرتی ہو۔

تورات جس کا موجودہ نام خمسہ موسوی ہے اور جو بائیبل کی پہلی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے' کا مطالعہ فرمائیے یا اناجیل اربعہ کا ان میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جس سے ان کے اصل ناموں کا پتہ چل سکے۔ یہی حال زبور کا ہے۔ دیگر انبیاء کی کتابیں اور صحیفے بھی اسی بائیبل (کتاب مقدس) میں موجود ہیں جس کے دو حصے ہیں:-

"عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید"

اس پوری کتاب میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں جس سے اس کے نام کی نشاندہی ہوتی ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ عظیم امتیاز اس کلام الٰہی کو حاصل ہے جو تاجدار کائنات ﷺ پر نازل ہوا کہ یہ ازخود اپنے نام کی ستر مرتبہ نشاندہی کرتا ہے۔

چند مقامات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (الواقعہ‘ ۵۶:۷۷)
بے شک یہ بزرگی والا قرآن ہے۔

۲۔ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ (البروج‘ ۸۵:۲۱)
بلکہ یہ بڑی عظمت والا قرآن ہے۔

۳۔ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ (یوسف‘ ۱۲:۳)
ہم نے آپ کی طرف قرآن وحی کیا ہے۔

۴۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (البقرہ‘ ۲:۱۸۵)
رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن اتارا گیا۔

۵۔ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (الاسراء‘ ۱۷:۹)
بیشک یہ قرآن اس (منزل) کی رہنمائی کرتا ہے جو سب سے درست ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کلام پاک کا نام "القرآن" کسی اور کا مجوزہ نہیں بلکہ منزل من اللہ یعنی الہامی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا نام بھی خود ہی نازل فرمایا ہے تو بہرصورت اس نام کی کوئی نہ کوئی نمایاں خصوصیت اور اہمیت ہونی چاہئے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ نام کی حیثیت ایسے عنوان کی ہوتی ہے جس سے مضمون کے مشمولات (Contents) کا ایک ہی نظر سے پتہ چل جاتا ہے۔ عنوان جامع ومانع ہو تو مضمون کے مشمولات پر ضرور دلالت کرتا ہے۔ اس عنوان ہی کو دیکھ کر مضمون کی اصل افادیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عنوان اور مضمون کا یہی تعلق اسم اور مسمیٰ کے درمیان بھی موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اسم سے مسمیٰ کے خصائص‘ تاثرات‘

کمالات اور حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب کا نام اور مضمون کلام کا عنوان خود اس لئے متعین فرمادیا کہ اس کے ذریعے انسانوں کو اس کتاب کے نفس مضمون کی عظمت واہمیت کا خود بخود اندازہ ہو جائے۔ یہ مقصد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے تجویز کردہ نام کے ذریعے اس حسن وخوبی سے انجام نہیں پا سکتا تھا۔

لفظ قرآن کا لغوی معنی

ہر چند کہ کسی لفظ کے محض لغوی معنی سے اس کی کامل معرفت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن کسی لفظ کی صحیح معرفت کے لئے اس کے لغوی مفہوم کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ لغوی مفہوم کا تعلق اس لفظ کے مادے (Origin) کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی مادے پر مصدر اور تمام مشتقات کے معانی کا انحصار ہوتا ہے۔ جتنے بھی لفظ اس مادے سے نکلتے ہیں ہر ایک میں اسی مادے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً معلوم، معلم، متعلم، تعلیم اور تعلم وغیرہ تمام مشتقات میں علم کا ہی مفہوم موجود ہے۔ اس لئے کسی بھی لفظ کے اصل مفہوم کی صحیح معرفت کے لئے اس کے لغوی اشتقاق کا علم نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔

لفظ قرآن کے لغوی معنی کے سلسلے میں علماء کرام کے دو موقف ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام جلال الدین سیوطیؒ کا موقف یہ ہے کہ لفظ "قرآن" غیر مشتق ہے۔ تورات اور انجیل کی طرح "القرآن" بھی ایسا اسمِ عَلَم ہے جو کسی اور لفظ یا مادے سے ماخوذ نہیں، لیکن علماء محققین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ لفظ قرآن مشتق ہے۔ علماء لغت نے اس کے مختلف مادے بیان کئے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ قَرَأَ　　　۲۔ قَرَنَ

۳۔ قِرَأۃٌ　　　۴۔ قَرَائِنٌ

لفظ قرآن کا پہلا مادہ اشتقاق: قرا

لفظ قرآن کا پہلا مادہ اشتقاق **قرء** ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے:۔

قراء الماء فی الحوض — اس نے حوض میں پانی جمع کیا۔

اس لحاظ سے "قرآن" کے دو معنی قرار پاتے ہیں:۔

۱۔ وہ کتاب جسے جمع کیا گیا۔

۲۔ وہ کتاب جس کے اندر سب کچھ جمع کر دیا گیا۔

پہلی معنوی دلالت

پہلے معنی کے اعتبار سے لفظ قرآن اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کتاب کا جمع کیا جانا بھی امر الٰہی کے تحت اور الہامی ہدایت کے مطابق ہو گا۔ اس کی شہادت ہمیں قرآن کے حکم سے اس طرح ملتی ہے:۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (القیامہ ۷۵: ۱۷) — بے شک اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔

اس لحاظ سے لفظ قرآن "مجموع" کے معنی میں تصور ہو گا۔ جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قرآن کی جمع و تدوین اور ترتیب سب کچھ الہامی ہے۔ اس میں کسی فرد کی ذاتی رائے یا استصواب کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اصطلاح شرح میں "قرآن اس منزل من اللہ معین مجموعہ کو کہا جاتا ہے جو کتابی صورت میں موجود ہے"۔ مولانا عبد الحق حسامی لکھتے ہیں:۔

وفی عرف الشرح علی المجموع المعین المنزل علی الرسول ﷺ (النامی شرح حسامی: ۵) — اور لفظ قرآن کا استعمال عرف شرح میں اس مجموع معین پر ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا۔

لفظ قرآن کے پہلے معنی نے اس کتاب کی جمع و تدوین کی نسبت عہد رسالت

مآب ﷺ سے لے کر عہد عثمانی تک کی گئی تمام کوششوں اور کاوشوں کی صحت وحقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ گویا یہ ہدایات ربانی کا ایسا مجموعہ ہے جو نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک صحیح حالت میں محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا مجموعہ ہونا بھی الہامی حفاظت کے تحت ہے۔ اس لئے نہ کوئی اس میں ردوبدل کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

دوسری معنوی دلالت

دوسرے معنی کے اعتبار سے لفظ قرآن اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کتاب کو "جامعیت" کا شرف حاصل ہے۔ زجاج اس قول کی تائید کرتے ہیں۔ علامہ زرکشی "البرہان فی علوم القرآن" میں اسی معنی کو نقل فرماتے ہیں۔ قرآن حکیم میں عورت کی عدت کے بارے میں حکم ہے۔ "**یَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ**" (البقرہ ۲: ۲۲۸) لفظ **قُرُوْءُ** **قَرْء** کی جمع ہے جو حیض (اور شوافع کے نزدیک طہر) کے لئے استعمال ہوا ہے۔ "عورتیں طلاق کی صورت میں تین حیض تک انتظار کریں"۔

بہر حال قرء کا اطلاق ایام حیض پر ہو یا طہر پر' یہ رحم میں خون کے جمع ہونے یا جمع شدہ خون کے جاری ہونے پر استعارہ ہے۔ چونکہ **قرء** میں بنیادی طور پر کسی شئے کے جمع ہونے کا معنی موجود ہے اس لئے اس مادے کی بناء پر قرآن کے لفظ میں بھی جامعیت اور ہمہ گیریت (Collection and Comprehension) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جو اس کتاب کے جامع اور محیط ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ گویا یہ وہ کتاب ہے جو ہر شئے کا علم اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے اور تمام علوم و معارف پر حاوی اور محیط ہے۔ اس معنی کی تصدیق و تائید خود قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے ہوتی ہے۔ قرآن اس لئے جامع ہے کہ اس میں جملہ حقائق کائنات اور تمام اقسام کے علوم و معارف اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیئے ہیں۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:۔

تسمیۃ هذا الکتاب قرآنا من بین کتب اللہ لکونہ جامعا لثمرۃ کتبہ بل لجمعہ ثمرۃ جمیع العلوم (المفردات)	اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں سے اس کو قرآن کہنا اس وجہ سے ہے کہ خدا کی نازل کردہ ساری کتابوں کے

ثمرات و مطالب اس میں جمع ہیں جبکہ یہ
تمام علوم و معارف کی بھی جامع ہے۔

قرآن کی جامعیت

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اول سے آخر تک اصلاً تمام حقائق و معارف اور جملہ علوم و فنون کی جامع ہے۔ قرآن خود کئی مقامات پر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۱۶:۸۹) اور ہم نے آپ پر وہ عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے۔

شئی کے لفظ کا اطلاق کائنات کے ہر وجود پر ہوتا ہے' خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی۔ جو چیز بھی رب ذوالجلال کی تخلیق ہے "شئی" کہلاتی ہے اور ہر شئے کا تفصیلی بیان قرآن کے دامن میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف ۱۲:۱۱۱) اور قرآن ہر شئے کی تفصیل ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:۔

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام ۶:۳۸) ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جسے صراحۃً یا کنایۃً بیان نہ کر دیا ہو)

چونکہ ازل سے ابد تک جملہ حقائق اور **ما کان و ما یکون** کے جمیع علوم قرآن مجید میں موجود ہیں اس لئے اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے:۔

وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (الانعام ۶:۵۹) اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)

اس آیت میں دو لفظ رطب اور یابس استعمال ہوئے ہیں۔ رطب کا معنی تر ہے اور یابس کا خشک' یہ آیت قرآنی ایجاز اور فصاحت و بلاغت کی دلیل اتم ہے کیونکہ کائنات ارض و سماء کا کوئی وجود اور کوئی ذرہ ایسا نہیں جو خشک یا تر یا دونوں حالتوں سے خارج ہو۔ بحر و بر' شجر و حجر' زمین و آسماں' جمادات و نباتات' جن و انس' خاکی ذرات

اور آبی قطرات' حیوانات اور دیگر مخلوقات الغرض عالم پست وبالا کی جس شے کا بھی تصور کرلیجئے۔ وہ یا تو خشک ہو گی یا تر' یا دونوں حالتوں کا مرکب ہو گی' قرآن نے صرف دو لفظ **وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ** استعمال کر کے درحقیقت ساری کائنات کے ایک ایک ذرے کا بیان کر دیا کہ اس کا علم قرآن میں موجود ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا (بنی اسرائیل' ۱۷:۱۲)

اور ہم نے (قرآن میں) ہر چیز کو پوری تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔

علامہ ابن برہان اسی کی تائید میں فرماتے ہیں:۔

ما من شئی فهو فی القرآن او فیه اصله (الاتقان' ۲:۱۲۶)

کائنات کی کوئی شئے ایسی نہیں جس کا ذکر یا اس کی اصل قرآن سے ثابت نہ ہو۔

گویا قرآن میں یا تو ہر چیز کا ذکر صراحت کے ساتھ ملے گا یا اس کی اصل ضرور موجود ہو گی۔ یہ بات لوگوں کی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت' فہم و بصیرت اور قوت استنباط و استخراج کے پیش نظر کہی گئی ہے۔ کیونکہ ہر کوئی ہر شئے کی تفصیل قرآن سے اخذ کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

اگر قدرت کی طرف سے کسی کو نور بصیرت حاصل ہو' انشراح صدر ہو چکا ہو' حجابات اٹھ چکے ہوں اور رب ذوالجلال نے اس کے سینے کو قرآنی معارف کا اہل بنا دیا ہو تو اسے ہر شئے کا تفصیلی بیان بھی نظر آجائے گا۔

اسی موقع پر امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اصلاً ذکر کا معنی یہ ہے:۔

ما من شئی الا یمکن استخراجه من القرآن لمن فهمه الله (الاتقان' ۲:۱۲۶)

کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا استخراج و استنباط آپ قرآن سے نہ کر سکیں۔ لیکن یہ علوم و معارف اسی پر آشکار ہوتے ہیں جس کو رب ذوالجلال خصوصی فہم سے بہرہ ور فرما دیں۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نبی اکرم ﷺ کے وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کو حضور علیہ السلام نے ترجمان القرآن کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا ان کے بارے میں جبرئیل امین نے یہ خوشخبری بھی دی تھی:۔

انہ کائن حبر ھذہ الامۃ

عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اس امت کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:۔

لو ضاع لی عقال بعیر لوجدتہ فی کتاب اللہ (الاتقان' ۲:۱۲۶)

(صحبت نبوی کے فیضان سے مجھے قرآن کی اسقدر معرفت حاصل ہو چکی ہے کہ) میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو جائے تو قرآن کے ذریعے تلاش کرلیتا ہوں۔

اونٹ کی رسی کا گم ہونا کتنا معمولی واقعہ ہے لیکن اہل بصیرت ایسا معمولی سے معمولی واقعہ اور حادثہ بھی قرآن سے معلوم کر لیتے ہیں۔ محقق ابن سراقہ "کتاب الاعجاز" میں جامعیت قرآن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ما من شئی فی العالم الا وھو فی کتاب اللہ (الاتقان' ۲:۱۲۶)

کائنات میں کوئی شئے ایسی نہیں جس کا ذکر قرآن میں موجود نہ ہو۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شئے قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ کائنات میں موجود نہیں ہو سکتی۔ گویا قرآن میں کسی چیز کا مذکور نہ ہونا کائنات میں اس کے موجود نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں کسی چیز کے ذکر یا عدم ذکر کو کائنات میں اس کے وجود و عدم کی دلیل تصور کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی نے جامعیت قرآن کی نسبت یہ دعویٰ کیا:۔

سلونی عما شئتم اخبرکم عنہ فی کتاب اللہ (الاتقان' ۲:۱۲۶)

جس چیز کی نسبت چاہو مجھ سے پوچھ لو' میں تمہیں اس کا جواب قرآن سے دوں گا۔

آپ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول بھی اپنی کتاب "الاتقان" میں نقل کیا ہے:

ما بلغنی حدیث عن رسول اللہ علی وجھہ الا وجدت مصداقہ فی کتاب اللہ (ایضاً)

آج تک رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث مجھے ایسی نہیں ملی جس کا واضح مصداق میں نے قرآن مجید میں نہ پایا ہو۔

تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب اور علوم و معارف کی جامع بھی یہی کتاب ہے۔ امام بیہقیؒ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں جن میں کائنات کے تمام علوم و معارف بیان کر دیئے۔ پھر ان تمام علوم کو چار کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) میں جمع کر دیا۔ پھر ان میں سے پہلی تین کتابوں کے تمام معارف کو قرآن حکیم میں جمع فرمایا اور اس طرح یہ قرآن ایسی جامع کتاب قرار پائی کہ ابن ابی الفضل المرسیؒ فرماتے ہیں:۔

جمع القرآن علوم الاولین والاخرین بحیث لم یحط بھا علما حقیقۃ الا المتکلم ثم رسول اللہ

(الاتقان، ۲:۱۲۶)

اس قرآن نے اول سے آخر تک، ابتداء سے انتہا تک کائنات کے تمام علوم و معارف کو اپنے اندر اس طرح جمع کر لیا ہے کہ فی الحقیقت خدا اور اس کے بعد رسول ﷺ کے سوا ان علوم کا احاطہ نہ کوئی آج تک کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس سلسلے میں مروی ہے:۔

من اراد العلم فعلیہ بالقران فان فیہ خبر الاولین والاخرین (ایضاً)

جو شخص علم حاصل کرنا چاہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا دامن تھام لے کیونکہ اسی قرآن میں ہی اول سے آخر تک سارا علم موجود ہے۔

تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف کا جامع ہونا، تمام موجودات عالم کے احوال

کا جامع ہونا اور تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب کا جامع ہونا یہ وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے باعث اس مقدس کتاب کا نام اللہ تعالیٰ نے "القرآن" رکھا ہے۔

جامعیت قرآن کی عملی شہادتیں

پہلی شہادت --- "حضور ﷺ کی عمر مبارک کا قرآن سے استشہاد"

امام جلال الدین سیوطیؒ "الاتقان" میں اس ضمن میں یہ آیت نقل کرتے ہیں:۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا جب کسی کی اجل آ جائے تو اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں فرماتے۔ (المنافقون، ۶۳:۱۱)

قرآن کریم کی اس آیت کا اطلاق عمومی ہر انسان کی موت پر ہے لیکن اہل علم و بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے نزول کے وقت اس میں وصال محمدی ﷺ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا تھا۔

یہ آیت "سورہ المنافقون" (جو قران مجید کی تریسٹھویں (۶۳) سورۃ ہے) کی آخری آیت ہے۔ جس کے بعد رب ذوالجلال نے "سورہ التغابن" کو منتخب فرمایا۔ تغابن ناپید ہو جانے اور ہست سے نیست ہو جانے کو کہتے ہیں۔ ۶۳ ویں سورت کے اختتام پر کسی پر وقت اجل کے آ جانے کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی ظاہری عمر مبارک ۶۳ ویں برس پر اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور اس آیت کے فوراً بعد سورۃ التغابن کا انتخاب مزید صراحت کے لئے تھا کہ اب اس ہستی مبارک کی حیات ظاہری کے ناپید ہو جانے کے بعد انعقاد قیامت کا ہی دور آئے گا۔ درمیان میں کسی اور نبی یا امت کا دور ممکن نہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام کا دور نبوت، روز قیامت سے متصل ہے اور درمیانی سارے عرصے کو یہی محیط ہے۔ کسی اور کا زمانہ باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنی درمیان والی انگلی اور انگشت شہادت کو ملا کر فرمایا تھا:۔

اناوالساعۃ کھاتین (جامع ترمذی ۲: ۴۴)	میں (یعنی میرا دور) اور قیامت دونوں آپس میں ان دو انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔

جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اسی طرح میرے دور نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ یا زمانہ نہیں۔ گویا یہ آیت آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک کے تعین کے ساتھ ساتھ آپ کے ختم نبوت کے اعلان پر بھی مشتمل ہے۔ اس شہادت سے "قرآن" کی شان جامعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسری شہادت ---- "اجرام فلکی کی دہری گردش"

امام غزالیؒ سے ایک غیر مسلم نے سوال کیا کہ اجرام فلکی یعنی سورج، چاند اور دیگر سیارگان فضا میں جو حرکت کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہے۔ ایک سیدھی اور دوسری معکوس۔ مثلاً مشرق سے مغرب کی طرف اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف۔ قرآن مجید میں ایک کا ذکر تو موجود ہے لیکن دوسری کا کہاں ہے؟ اس پر امام غزالی نے اس شخص سے پوچھا کہ پہلی حرکت کا ذکر کس آیت میں ہے؟ اس نے یہ آیت پڑھی:۔

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین ۳۶: ۴۰)	سارے سیارے (فضا میں) تیرتے رہتے ہیں یعنی حرکت پذیر رہتے ہیں۔

امام غزالی نے فرمایا کہ اسی آیت میں ان کی حرکت معکوس کا ذکر بھی ہے۔ اگر کل فی فلک کے الفاظ کو الٹا کر کے (یعنی معکوس طریقے سے پڑھا جائے) یعنی **فلک** کی "ک" سے شروع کر کے کل کی "ک" تک پڑھا جائے تو پھر بھی "**کل فی فلک**" ہی بنے گا۔ گویا آیت کے اس حصہ کو سیدھی سمت میں پڑھنے سے سیارگان فلکی کی سیدھی حرکت کا ذکر ہے اور معکوس سمت میں پڑھنے سے حرکت معکوس کا ذکر ہے۔

(**کل فی فلک** کو الٹی سمت سے پڑھئے، فلک میں آخری حرف "ک" ہے۔ پھر "ل" ہے تو یہ کل بن گیا۔ اب الٹی سمت سے اگلا حرف "ف" ہے اور پھر "ی"۔ اس طرح یہ **فی** بن گیا۔ اس کے بعد "ف" آتا ہے۔ پھر "ل" اور آخری حرف

ہے تو فلک ہو گیا۔ چنانچہ اسی ترتیب سے کل فی فلک بنتا ہے۔ یہی سیارگان کی سیدھی حرکت ہے اور انہی لفظوں میں ان کی الٹی حرکت بھی مذکور ہے)۔

تیسری شہادت --- "واقعہ تسخیر ماہتاب اور قرآن"

اس ضمن میں ایک اور شہادت تسخیر ماہتاب کے واقعہ سے متعلق ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل امریکہ کے تین سائنس دانوں کے ہاتھوں تسخیر ماہتاب کا عظیم تاریخی کارنامہ انجام پذیر ہوا تھا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے چودہ سو سال پہلے اعلان کر دیا تھا:۔

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ○ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ○ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○
(الانشقاق، ۸۴: ۱۸-۲۰)

اور قسم ہے چاند کی جب وہ پورا دکھائی دیتا ہے۔ تم یقیناً طبق در طبق ضرور سواری کرتے ہوئے جاؤ گے تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔

ان تینوں آیات کا باہمی ربط اور سیاق و سباق یہ ہے کہ اس سورت میں قیامت سے پہلے رونما ہونے والے حادثات اور واقعات کا ذکر ہے۔ مذکورہ بالا آیات سے پہلے اجرام فلکی، کائناتی نظام اور بالخصوص نظام شمسی کے اہم پہلوؤں کا بیان ہے۔ اسی طرح اس میں کائنات کے اہم تغیرات کا بھی ذکر ہے۔ پھر مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں۔ کبھی شفق کی اور کبھی رات کی، تیسری قسم چاند کی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا کہ تم یقیناً ایک طبق سے دوسرے طبق تک پہنچو گے۔ یعنی تم طبق در طبق پرواز کرو گے۔

اس آیت کی علماء نے متعدد تفسیرات بیان کی ہیں۔ اس کا معنوی اطلاق "واقعہ معراج" پر بھی کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے طبق در طبق سے انسانی اعمال

"امام غزالی سے متعلق اصل حوالہ راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ مجھ سے قبلہ والد محترم حضرت علامہ ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ نے بیان فرمایا تھا۔"

و درجات کا بلند ہونا مراد لیا ہے۔ بعض نے حیات انسانی کے مختلف مراحل ارتقاء اور احوال مراد لئے ہیں۔ احادیث نبوی سے بھی "حال در حال" کے معنی کا استشہاد لیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کی متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں۔ وہ سب اپنی جگہ درست اور ناقابل تردید ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر پہلے کسی آیت کی ایک تفسیر بیان ہو چکی ہو تو اس کا صرف وہی ایک ہی مفہوم ہو گا اور باقی مفاہیم' مطالب اور تعبیرات غلط ہوں گی۔ تفسیر قرآن کے ضمن میں ایسی بات درست نہیں۔ قرآن حکیم کی ایک آیت سے اہل علم متعدد تعبیرات اخذ کرتے چلے آئے ہیں اور متقدمین و متاخرین کی کتب تفسیر اس پر شاہد عادل ہیں۔ مختلف احوال پر انطباق کے اعتبار سے ہر تعبیر اپنی جگہ درست ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم اس مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے تفسیر آیت عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے:۔

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ (الانشقاق' ۸۴:۱۸)	اور قسم ہے چاند کی جب وہ پورا دکھائی دیتا ہے۔
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق' ۸۴:۱۹)	تم یقیناً طبق در طبق ضرور سواری کرتے ہوئے جاؤ گے۔
فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (الانشقاق' ۸۴:۲۰)	تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔

قرآن حکیم کا انداز بیان' ربط بین الآیات اور نظم عبارت کا ایک ایک پہلو بلکہ ایک ایک حرف مستقل مفہوم' نمایاں افادیت اور خاص حکمت و مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" سے پہلے متصلاً قرآن حکیم کا چاند کی قسم کھانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آگے بیان ہونے والی حقیقت چاند سے ہی متعلق ہو گی۔

لترکبن' رکب یرکب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی پر سوار ہونا۔ اسی سے اسم ظرف نکلا ہے یعنی سوار ہونے یا بیٹھنے کی جگہ' گھوڑے پر سوار ہوتے وقت جس پر پاؤں رکھا جاتا ہے۔ اسے بھی اسی وجہ سے رکاب کہتے ہیں۔

گویا لترکبن کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اوپر جانا کسی سواری کے

بنی آدم! تم میں سے کم از کم تین افراد پرواز کریں گے"۔ کہاں سے کہاں تک طبقا عن طبق ایک طبق سے دوسرے طبق تک۔ پہلا طبق تو یقیناً زمین ہے کیونکہ مخاطب اہل زمین تھے اور کسی دوسرے طبق تک جائیں گے۔ دوسرے طبق کا تعین بھی حکیمانہ انداز میں کیا گیا۔ اگر یہاں دوسرے طبق کے لفظ کی بجائے سیدھا چاند ہی کہہ دیا جاتا تو پھر تسخیر کائنات کی مہم صرف طبق مہتاب تک محدود و محصور ہو کر رہ جاتی اور رب ذوالجلال کو یہ منظور نہ تھا کہ انسان کی پرواز زمین کے بعد چاند پر جاکر رک جائے بلکہ وہ چاند کے بعد دیگر اجرام فلکی کی تسخیر بھی چاہتا تھا۔ اس لئے لفظ طبق کو تنوین کے ساتھ عام کر دیا تاکہ یکے بعد دیگرے انسان اجرام وطبقات کائنات کو تسخیر کرتا چلا جائے اور راز کائنات فاش کرنے کی مہم جاری رہ سکے۔ لیکن پہلا طبق جس پر اولاً انسان پہنچے گا وہ چاند ہو گا۔ اس لئے اس کی قسم پہلے کھائی گئی۔ کیونکہ زمین کے سب سے زیادہ قریب چاند ہی کا طبق تھا۔ باقی سب اس کے مقابلے میں دور تھے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اہل زمین کو یہ پیشینگوئی سنائی گئی کہ تم میں سے کم از کم تین شخص کسی چیز پر سوار ہو کر پرواز کریں گے اور زمین کے طبق سے چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن تسخیر مہتاب کے بعد انسان کی تگ ودو ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ جاری رہے گی۔ اب اسی طرح مریخ کے طبق تک بھی انسان رسائی حاصل کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ انسانی پرواز کی یہ کامیاب کاوشیں دراصل واقعہ معراج کی صحت وحقانیت پر روشن مادی دلیلیں بنتی جارہی ہیں۔ بقول اقبال":۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ معجزات وکرامات جن کے امکان ووقوع کو انسانی عقل منطقی پیمانوں پر سمجھنے سے قاصر تھی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے کسی حد تک ان کے سمجھنے کی مادی اور عقلی بنیادیں فراہم کر دی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ امر منکشف ہوتا جارہا ہے کہ انسان جسے ایک دور میں ناممکن سمجھتا ہے وہ

مستقبل میں نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے نام نہاد تعقل پسند طبقے کے انکار خوارق کی یہ دلیل کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور سمجھ میں نہیں آتی قابل التفات نہیں رہتی کیونکہ عقل کا انحصار صرف محسوسات ومشاہدات پر ہوتا ہے اور جب تک کوئی حقیقت محسوس نہ ہو یا اس کی کوئی مثل مشاہدے میں نہ آئی ہو۔ عقل اس کے امکان کو کیونکر سمجھ سکتی ہے۔ اس لئے عقل کا فیصلہ جزئی واضافی ہوتا ہے۔ وہ کلی ومطلق نہیں ہو سکتا۔ جب کہ قرآن کا ہر دعویٰ ابدی ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ انسانی عقل قرآن کے بعض دیگر دعاوی واعلانات کو آج ممکن نہ سمجھے لیکن مستقبل کے کسی دور میں وہ سب کچھ ممکن اور واقع نظر آنے لگے۔ لہٰذا محض عقل کے قصور فہم کی بنا پر کسی حقیقت کا انکار کر دینا نادانی ہے۔ عافیت ایمان بالغیب میں ہی ہے۔

مزید برآں تسخیر ماہتاب کی متذکرہ بالا قرآنی تعبیر کی نسبت اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس موقع پر تین امریکی سائنسدانوں میں سے صرف دو چاند کی سطح پر اترے تھے اور تیسرا شخص چاند گاڑی کے اس حصے پر رہا تھا۔ جو چاند کے گرد گھومتا رہا تاکہ بعد ازاں گاڑی کے چاند پر اترنے والے حصے کو ساتھ ملا کر واپس لا سکے۔ لہٰذا لتو کبن کا اطلاق تین افراد پر کیسے ہو گیا۔ یہ اعتراض دراصل غور وفکر نہ کرنے کے باعث پیدا ہو گا۔ بات چاند کی سطح پر اترنے کی نہیں بلکہ چاند کے طبق تک پہنچنے کی ہو رہی ہے اور یہی لتر کبن طبقا عن طبق کے الفاظ سے مستفاد ہے۔ اس امر کا اعتراف تو صاحب اعتراض کو بھی ہو گا کہ اس طبق تک تو تین ہی افراد پہنچے۔ ایک گاڑی پر چاند کے گرد گھومتا رہا اور دو اس کی سطح پر اتر گئے طبق محض کسی سیارے کی سطح (Soil Surface) کو نہیں کہتے بلکہ کسی سیارے اور اس کے گرد فضائی حدود پر مشتمل اس وسیع وعریض حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک اس سیارے کی کشش ثقل (Force of Gravitation) اثر انداز ہوتی ہے اور یہ علاقہ یا طبق سیارے کی سطح کے گرد فضا میں ہزاروں میل تک محیط ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز کی پرواز زمین کی سطح پر نہیں بلکہ اس سے اوپر فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوتی ہے۔ لیکن طبق ارضی میں ہی تصور کی جاتی ہے۔

چنانچہ قرآن ہی طبق ارضی سے پرواز کرکے انسان کے دیگر طبقات فلکی تک پہنچنے کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ انسان کی ایسی کامیابیوں کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کائنات کے اندر یعنی آسمانوں اور زمین کی وسعتوں میں جو کچھ موجود ہے وہ انسان کے لئے تخلیق کیا گیا اور انسان ہی کے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ '۴۵: ۱۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لئے مسخر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد سورہ انشقاق کی زیر مطالعہ آیت سے آگے فرمایا گیا:۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

تو انہیں کیا ہو گیا کہ ایمان نہیں لاتے۔

(الانشقاق '۸۴: ۲۰)

اے فرزندان آدم! تم میں سے کچھ افراد زمین سے اٹھ کر چاند کے طبق تک پہنچیں گے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اس دعوے کے پورا ہو جانے اور اس طبق پر بھی ہماری قدرت کا نظام دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان نہ لانے کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تسخیر ماہتاب کی مہم غیر مسلموں کے ہاتھ سے سر ہو گی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تین غیر مسلم سائنسدان چاند تک پہنچے' وہاں بھی تخلیق خداوندی کے مناظر دیکھے۔ اس کے نظام قدرت کا مشاہدہ کیا۔ لیکن قرآنی دعوے کے مطابق ان کی قوم قرآن کی حقانیت پر ایمان نہ لائی۔

تسخیر کائنات کے مذکورہ بالا قرآنی بیان کی ایک غیر مسلم فرانسیسی سکالر Maurice Bucaille نے اپنی کتاب "The Bible the Quran and Science" کے صفحات نمبر ۱۶۷ تا ۱۶۹ پر "The Quran and Modern Science" کے باب میں "The Conquest of Space" کے زیر عنوان ان الفاظ سے فراہم کی ہے:۔

THE CONQUEST OF SPACE

From this point of view, three verses of the Qur`an should command our full attention. One expresses, without any trace of ambiguity, what man should and will achieve in this field. In the other two, God refers for the sake of the unbelievers in Makka to the surprise they would have if they were able to raise themselves up to the Heavens; He alludes to a hypothesis which will not be realized for the latter.

There can be no doubt that this verse indicates the possibility men will one day achieve what we today call (Perhaps rather improperly) "the conquest of space". One must note that the text of the heavens, but also the Earth, i.e. the exploration of its depths.

1) The first of these verses is sura 55, verse 33: "O assembly of Jinns and Men, if you can penetrate regions of the heavens and the earth, then penetrate them! You will not penetrate them save with a power."

2) The other two verses are taken from sura 15, (verses 14 and 15). God is speaking of the unbelievers in Makka. as the context of this passage in the sura shows:

"Even if We opened unto them a gate to Heaven and they were to continue ascending therein, they would say: our sight is confused as in drunkenness. Nay, we are people bewitched."

The above expresses astonishment at a remarkable spectacle, different from anything man could imagine.

When talking of the conquest of space therefore. We have two passages in the text of the Qur`an: one of them refers to what will one day become a reality thanks to the powers of intelligence and ingenuity God will give to man, and the other describes an event that the unbelievers in Makka will never witness, hence its character of a condition never to be realized. The event will however be seen by others, as intimated in the first verse quoted above.

It describes the human reactions to the unexpected spectacle that travelers in space will see: their confused sight, as in drunkenness, the feeling of being bewitched ....

This is exactly how astronauts have experienced this remarkable adventure since the first human spaceflight around the world in 1961. It is a completely new spectacle therefore that presents itself to men in space, and the photographs of this spectacle are well known to present day man.

چنانچہ یہ دعویٰ بجاطور پر حق ہے کہ کائنات کے اندر جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کے اندر موجود ہے۔

چوتھی شہادت

جامعیت قرآن کی نہایت وقیع اور عملی شہادت یہ بھی ہے کہ قرآن اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کی نجی زندگی کی فکری و عملی ضروریات سے لے کر عالمی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے۔ حیات انسانی کا مذہبی و روحانی پہلو ہو یا مادی و جسمانی، عائلی و خاندانی پہلو ہو یا سماجی و معاشرتی، سیاسی و معاشی پہلو ہو یا تعلیمی و ثقافتی، حکومت و سلطنت کی تاسیس ہو یا ادارت کی تشکیل، مختلف طبقات انسانی کے نزاعات و معاہدات ہوں یا اقوام عالم کے باہمی تعلقات، الغرض قرآنی احکام و تعلیمات اس قدر جامع ہیں کہ ہر مسئلے میں اصولی رہنمائی قرآن ہی سے میسر آتی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے علماء نے آیات قرآنی کی تقسیم بھی کی ہے۔ معروف قول کے مطابق قرآن حکیم کی کل آیات (۶۶۶۶) کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ آیات امر (۱۰۰۰) آیات نہی (۱۰۰۰) آیات وعدہ (۱۰۰۰) آیات وعید (۱۰۰۰) آیات مثال (۱۰۰۰) آیات قصص (۱۰۰۰) آیات تحلیل (۲۵۰) آیات تحریم (۲۵۰) آیات تسبیح (۱۰۰) آیات متفرقہ (۶۶)

قرآنی احکام کا بیان و استنباط کہیں "عبارۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اشارۃ النص" سے کہیں "دلالۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اقتضاء النص" سے کہیں اس کا انداز "حقیقت" ہے کہیں "مجاز" کہیں "صریح" ہے کہیں "کنایہ" کہیں

"ظاہر" ہے کہیں "خفی" کہیں "مجمل" ہے کہیں "مفسر" کہیں "مطلق" ہے کہیں "مقید" کہیں "عام" ہے اور کہیں "خاص"۔ الغرض قرآنی تعلیمات مختلف صورتوں اور طریقوں میں موجود ہیں۔ ان میں اصل احکام (Substantive Laws) بھی ہیں اور ضابطہ جاتی احکام (Procedural Laws) بھی۔ جیساکہ اس آیت سے ثابت ہے:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا
(المائدہ ۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک اصل قانون بنایا اور ایک اس کا ضابطہ و طریق کار۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات سے متعلق قوانین اور اصول و ضوابط کا استخراج اصلاً قرآن ہی سے کیا ہے۔

اسی طرح قرآن علوم کے بیان کے اعتبار سے بھی جامع و مانع ہے۔ دنیا کا کوئی مفید علم ایسا نہیں جس کا سرچشمہ قرآن نہ ہو' قاضی ابوبکر بن عربیؒ اپنی کتاب "قانون التاویل" میں ابتدائی طور پر قرآنی علوم کی تعداد ستتر ہزار چار سو پچاس (۷۷۴۵۰) بیان کرتے ہیں۔ یہی تعداد قرآن مجید کے کلمات کی بھی ہے تو اس سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ قرآن حکیم میں **اَلْحَمْد** سے **وَالنَّاس** تک استعمال ہونے والا ہر کلمہ یقیناً کسی نہ کسی مستقل علم اور فن کی بنیاد ہے۔ گویا ہر قرآنی حرف سے کوئی نہ کوئی علم اور فن جنم لے رہا ہے۔ یہاں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ حدیث رسول اللہ ﷺ بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ظاہر و باطن کے لئے ایک حد آغاز ہے اور ایک حد اختتام۔ اس لحاظ سے ہر قرآنی حرف کے چار پہلو متعین ہوئے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن عربیؒ متذکرہ الصدر تعداد کو پھر چار سے ضرب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ درحقیقت قرآنی علوم کی تعداد کم از کم تین لاکھ نو ہزار آٹھ سو (۳۰۹۸۰۰) ہے۔ یہ تو ایک بزرگ کی وسعت نظر ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ امام رازی سے پوچھیں تو وہ فرماتے ہیں کہ صرف تعوذ و تسمیہ (**اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** اور **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**) میں لاکھوں مسائل کا بیان

[illegible]

قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی صحیح تعداد کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ۔ ایسے اقوال یا تو ان اکابر کی تحقیقات ہیں یا ان کے ذاتی انکشافات، در حقیقت قرآنی علوم احصاء و تحدید سے ماوراء ہیں۔ کوئی علم ہو یا فن، کوئی صنعت و حرفت ہو یا پیشہ تجارت، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی دریافت ہو یا علوم قدیمہ کی، اس کائنات میں کوئی ایسی شئے معرض وجود میں نہیں آئی اور نہ آسکتی ہے جس کا ذکر خلاق عالم نے کسی نہ کسی انداز سے قرآن مجید میں نہ کر دیا ہو۔

فلسفہ (Philosophy) تمام علوم کا سرچشمہ اور مبداء تصور کیا جاتا ہے۔ علم طبیعات (Physics) اور علم حیاتیات (Biology) بھی ابتداءً فلسفے ہی کا حصہ تھے۔ طبیعی کائنات کے حقائق سے بحث کرنے والے علوم یہی تین ہیں۔

فلسفہ شروع سے آج تک تین چیزوں سے بحث کرتا چلا آیا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟ اعلیٰ ترین نصب العین کیا ہے؟ گویا فلسفے کی بحث حقیقت، علم اور نصب العین سے ہے۔ اسی طرح طبیعات کا موضوع تحقیق یہ ہے کہ موجودات عالم اور مظاہر طبیعی کا آغاز کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اور ان مظاہر طبیعی کی حرکت کی علت کیا ہے؟ حیاتیات کا موضوع یہ ہے کہ انسان اور دیگر مظاہر حیات کی اصل کیا ہے؟ اور تمام مظاہر حیات کی حرکت اور زندگی کی علت کیا ہے؟ تینوں علوم کا خلاصۂ مبحث یہ ہوا کہ:۔

فلسفہ کائنات کی حقیقت، اعلیٰ نصب العین اور اس کے علم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ طبیعات مظاہر طبیعی اور ان کی حرکت کو جاننے میں مصروف ہے۔ جب کہ حیاتیات مظاہر حیات کے آغاز اور ان کے ارتقاء کو سمجھنے میں مشغول ہے۔ آج تک یہ علوم اقدام و خطا (Trial and Error) کے انداز میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک علم و فن نے بھی یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مظاہر حیات کے نقطۂ آغاز کو یقینی طور پر جان لیا یا اس نے ان کی حرکت کی علت کو حتمی طور پر متعین کر لیا ہے۔ اسی طرح فلسفہ آج تک یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ یہ

حقیقت کائنات کی حتمی و ابدی حقیقت ہے۔ ہندوستان کے ۹ کے ۹ فلسفے نفس ناطقہ کو بھی حقیقت مانتے ہیں اور مادہ کو بھی۔

فلسفہ اور قرآن

ہزاروں سال کی انسانی جدوجہد کے باوجود آج تک یہ علوم وفنون اپنی صحت اور کمال کی حتمی منزل کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن آخری الہامی کتاب قرآن کا یہ عالم ہے کہ سورہ علق کی صرف پہلی ہی پانچ آیتوں نے فلسفے کے تمام مسائل کو حل کر دیا ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں:۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ○

(العلق، ۹۶:۱۔۵)

اپنے رب کے نام سے پڑھیئے جس نے (سب کچھ) پیدا فرمایا۔ اس نے انسان کو (رحم مادر میں) جونک کی طرح معلق وجود سے پیدا کیا۔ پڑھئے اور آپ کا رب بڑا ہی کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے (لکھنے پڑھنے کا) علم سکھایا۔ (جس نے) انسان کو (اس کے علاوہ بھی) وہ (کچھ) سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اگر غور کریں تو ان آیات میں فلسفہ کے جملہ موضوعات اور ان کے حتمی جوابات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ **فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَار**

ان آیات کی تفسیر اور وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لئے آج تک تاریخ انسانی میں جتنی فلسفیانہ کوششیں ہوئی ہیں۔ وہ سب قطعیت و حتمیت سے محروم ہیں۔ لیکن قرآن کی جامعیت و قطعیت کا یہ عالم ہے کہ صرف پانچ مختصر فقرات میں فلسفے کے تمام موضوعات، مسائل تحقیق اور ان کے حتمی جوابات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اب یہ اہل تحقیق کا کام ہے کہ وہ اس رخ پر ریسرچ کریں اور ان حقائق کائنات کی کامل

معرفت حاصل کر لیں۔

سائنس اور قرآن

اسی طرح طبیعی اور حیاتیاتی سائنس جن مسائل پر تحقیق سے عبارت ہے وہ اصطلاحات کی صورت میں درج ذیل ہیں:۔

۱۔ تخلیق کائنات اور اس کا تشکیلی نظام

(Creation of Universe and Its structural system)

۲۔ زمانہ ہائے تخلیق اور ادوار ارتقاء

(Periods of Creation and Eras of Euolution)

۳۔ وجود کائنات کی طبیعی اور کیمیائی اساس

(Physical and Chemical bassis of the formation of Universe)

۴۔ زمین اور ظہور زندگی

(Earth and Appearance of Life)

۵۔ ارتقائے حیات کے طبیعی اور کیمیائی مراحل

(Physical and Chemical Process of Evolution of Life)

۶۔ اجرام فلکی کی ماہیت اور نظام کار

(Nature and Phenomena of Heavenly Bodies)

۷۔ انسانی زندگی کا آغاز اور نظام ارتقاء

(Origin of Human Life and Its Development)

۸۔ نباتات وحیوانات کی زندگی

(The Vegetable and Animal Kingdoms)

۹۔ افزائش نسل انسانی کا نظام

(System of Human Production and Self Perpetuation)

ان تمام سائنسی موضوعات پر قرآن حکیم نے بہت سا بنیادی مواد فراہم کیا ہے جو اس میں سینکڑوں مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ ہم **استشہاد** کے طور پر یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں:۔

۱۔ **أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ آيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ ○**

(الانبیاء ۲۱: ۳۰۔ ۳۴)

کیا ان کافروں نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کے بالائی اور زیریں حصے دونوں باہم پیوست تھے یعنی ایک تخلیقی وحدت (Unit of Creation) کی صورت میں موجود تھے۔ ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر کے کھول دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے تخلیق کیا۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ہم نے زمین کی تیز رفتاری کے باعث اس میں پیدا ہونے والی جنبش کو ختم کرنے کے لئے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے تاکہ وہ اپنے اوپر بسنے والی مخلوق کو لے کر کانپے بغیر حرکت پذیر رہے اور ہم نے اس میں (بحری، بری اور فضائی) کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ اپنی اپنی منازل سفر تک جا سکیں اور ہم نے آسمانی کائنات کو محفوظ چھت بنایا۔ اور (کیا) وہ اس کی نشانیوں سے اب بھی روگرداں ہیں؟ اور وہی ذات ہے جس نے رات

اور دن بنائے اور سورج اور چاند جو اپنے اپنے مدار اور فلک میں گردش پذیر ہیں اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر (ارضی مخلوق) کو ایسی ہمیشگی اور دوام نہیں بخشا (کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پر بدلے یا ختم ہوئے بغیر قائم رہی ہو) اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ طعنہ زنی کرنے والے ہمیشہ رہیں گے؟

۲۔ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ أَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ (نوح ۷۱: ۱۴۔۲۰)

حالانکہ اس نے تمہیں نوع بنوع اور درجہ بدرجہ تخلیق کیا۔ یعنی تمہیں تخلیق کے کئی مراحل، ادوار اور احوال سے گزار کر مکمل کیا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے کس طرح آسمانی کائنات کے سات تدریجی طبقات بنائے اور ان میں چاند کو انعکاسی نور سے روشن کیا اور سورج کو چراغ (کی طرح روشنی کا منبع) بنایا۔ اور اللہ نے تمہیں زمین میں سے سبزے (Geneological Tree) کی طرح اٹھایا۔ پھر وہ تمہیں اسی میں لے جائے گا۔ اور تمہیں دوبارہ نئی زندگی کے ساتھ باہر نکالے گا اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو بچھایا ہوا قطعہ بنایا۔ تاکہ تم اس کے کشادہ راستوں پر چلو۔

۳۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ
مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ ○
یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ
یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ ذٰلِکَ عٰلِمُ
الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○
الَّذِیْۤ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ
خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ
نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ○ ثُمَّ
سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَکُمُ
السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا
تَشْکُرُوْنَ ○ (السجدہ' ۳۲:۴-۹)

اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں یعنی چھ ادوار میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش یعنی کائنات کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوا۔ اسے چھوڑ کر نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ سفارشی۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ وہ اپنے اوامر اور معاملات کی تدبیر آسمان سے اس لئے کرتا ہے کہ زمین یعنی نچلی کائنات میں انکا نفاذ اور تعمیل ہو' پھر وہ امور رفتہ رفتہ اسی کی طرف اوپر اٹھائے جائیں گے۔ اس تدریجی مرحلے کی تکمیل ایک دن (One Era of Evolution) میں ہوگی جس کا عرصہ تمہارے شمار کے مطابق ہزار سال پر محیط ہے۔ وہی ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا (اور) عزت ورحمت والا ہے۔ جس نے ہر اس چیز کو' جسے اس نے پیدا کیا' (اس کے حال کے مطابق) نہایت احسن اور مناسب صورت میں تشکیل دیا اور اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء زمین کی مٹی یعنی غیرنامی مادے (Inorganic Matter) سے کی' پھر اس کی

نسل کو کمزور اور بے قدر پانی (Fluid
(Despised) کے نچوڑ سے چلایا۔ پھر
اس وجود کو صحیح شکل وصورت دی اور
اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔
یعنی اسے زندگی عطا کی' بعدازاں تمہیں
سماعت اور دل ودماغ (Faculties
(Physical and Mental
سے نواز دیا لیکن تھوڑے لوگ ہی ان
نعمتوں پر شکر بجالاتے ہیں (یعنی ان کا صحیح
استعمال کرتے ہیں)۔

اگر آپ مذکورہ بالا تین مقامات پر ہی غور وفکر کریں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی کہ طبیعات (Physics) اور حیاتیات (Biology) کے جملہ مسائل پر اصولی اور بنیادی رہنمائی قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی اسی وسعت علمی کا نام "جامعیت" ہے' جو اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

پانچویں شہادت------ "قرآن تمام نقلی فنون کا ماخذ ہے"

علوم وفنون کے اعتبار سے جامعیت قرآن کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ علماء اسلام نے جملہ علوم کی انواع واقسام سب قرآن حکیم سے ہی اخذ کی ہیں۔ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں جب علوم وفنون کی باقاعدہ تقسیم اور علم وفن کی تفصیلات مرتب کرنے کا کام سرانجام دیا جانے لگا تو علماء کی ایک جماعت نے لغات وکلمات قرآن کے ضبط وتحریر کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیا۔ اس نے مخارج حروف کی معرفت' مد کلمات کا شمار' سورتوں اور منزلوں کی گنتی' سجدات وعلامات آیات کی تعداد وتعیین' حصر کلمات' متشابہ ومتماثلہ آیات کا احصاء' الغرض تعرض معانی ومطالب کے بغیر

جملہ مسائل قرات کا کام سرانجام دیا۔ ان کا نام قراء رکھا گیا اور اس طرح "**علم القراۃ والتجوید**" منصۂ شہود پر آیا۔ بعض نے قرآن کے معرب و مبنی، اسماء و افعال اور حروف عاملہ و غیر عاملہ وغیرہ کی طرف توجہ کی تو "**علم النحو**" معرض وجود میں آیا۔ بعض نے الفاظ قرآن، ان کی دلالت و اقتضاء اور ان کے مطابق ہر حکم کی تفصیلات بیان کیں تو "**علم التفسیر**" وجود میں آیا۔ بعض نے قرآن کے اَدِلّۂ عقلیہ اور شواہدِ نظریہ کی جانب التفات کیا اور اللہ تعالیٰ کے وجود و بقاء، قدم و وجوب، علم و قدرت، تنزیہہ و تقدیس، وحدانیت و الوہیت، وحی و رسالت، حشر و نشر، حیات بعد الموت اور اس قسم کے دیگر مسائل بیان کئے تو "**علم الاصول**" اور "**علم الکلام**" وجود میں آئے۔ پھر انہی اصولیین میں سے بعض نے قرآن کے معانی خطاب میں غور کیا اور قرآنی احکام میں اقتضاء کے لحاظ سے عموم و خصوص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ، اطلاق و تقیید، نص، ظاہر، مجمل، محکم، خفی، مشکل، متشابہ، امر و نہی اور نسخ وغیرہ میں کلام کیا، انواع قیاس اور دیگر اَدِلّہ کا استخراج کیا تو فن "اصول فقہ" تشکیل پذیر ہوا۔ بعض نے قرآنی احکام سے حلال و حرام کی تفصیلات و فروعات طے کیں تو "**علم الفقہ**" یا "**علم الفروع**" کو وجود ملا۔ بعض نے قرآن سے گزشتہ زمانوں اور امتوں کے واقعات و حالات کو جمع کیا اور آغاز عالم سے قیامت تک کے آثار و وقائع کو بیان کیا۔ اس طرح "**علم التاریخ**" اور "**علم القصص**" وجود میں آئے۔ بعض نے قرآن سے حکمت و موعظت، وعد و وعید، تحذیر و تبشیر، موت و معاد، حشر و نشر، حساب و عقاب اور جنت و نار کے بیانات اخذ کئے، جس سے "**علم التذکیر**" اور "**علم الوعظ**" کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے مختلف خواب اور ان کی تعبیر کے اصول اخذ کئے تو "علم تعبیر الرؤیا" کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے "**علم المیراث**" اور "**علم الفرائض**" کی تفصیلات بیان کیں۔ بعض نے رات، دن، چاند، سورج اور ان کی منازل وغیرہ کے قرآنی ذکر سے "**علم المواقیت**" حاصل کیا۔ بعض نے قرآن کے حسن الفاظ، حسن سیاق، بدیع، نظم اور اطناب و ایجاز وغیرہ سے "**علم المعانی**" "**علم البیان**" اور

"علم البدیع" کو مدون کیا۔ عرفاء کاملین نے قرآن میں نظر و فکر کے بعد اس سے معانی باطنہ اور دقائق مخفیہ کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اس سے تزکیہ و تصفیہ، فنا و بقاء، غیبت و حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت اور قبض و بسط وغیرہ کے حقائق و تصورات بھی اخذ کئے۔ جن سے "علم التصوف" کی تشکیل ہوئی۔

بعض علماء نے قرآن سے طب، ہیئت، ہندسہ، جدل، جبر و مقابلہ، نجوم اور مناظرہ وغیرہ کے علوم و فنون اخذ کئے اور ان کی تفصیلات بھی طے کیں۔ اس طرح یہ مقدس اور جامع الہامی کتاب بالفعل دنیا کے ہر فن اور علم کے لئے منبع و سرچشمہ قرار پا گئی۔

امام موسیٰؒ نے مزید تفصیل کے ساتھ مذکورہ بالا موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کی تلخیص امام جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں کی ہے۔ الغرض دنیا میں موجود ہر فن و صنعت جو انفرادی، اجتماعی اور عالمی سطح پر انسانی زندگی کی بقاو دوام اور فروغ و ارتقاء کے لئے ضروری ہے اصلاً قرآن سے ثابت ہے۔ علوم و فنون کے حوالے سے قرآن مجید کی جامعیت کے اس بیان سے یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو گئی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو محض ذکر و عبادت اور اخلاق و روحانیت کا ہی درس نہیں دیتا بلکہ دنیا میں ہر قسم کی علمی، فنی، صنعتی، سائنسی اور فوجی ترقی کی راہیں بھی کشادہ کرتا ہے تاکہ ملت اسلامیہ ایک ہمہ گیر ترقی پسند امت کے طور پر ابھرے اور آفاقی سطح پر انقلاب بپا کر کے عظیم مقام حاصل کر لے۔ کیونکہ اس کے بغیر عالمگیر غلبۂ حق کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسی کی نشاندہی قرآن نے پیغمبر اسلام ﷺ کے مقصد بعثت کے حوالے سے فرمادی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○

(الصف، ۶۱:۹)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول معظم کو ہدایت اور دین حق دے کر اس لئے بھیجا کہ اس نظام حق کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ بیشک مشرک

(یعنی کفر و طاغوت کے علمبردار) اس کی مخالفت کرتے رہیں۔

اسی جامعیت کی بنا پر رب ذوالجلال نے اس مقدس کتاب کا نام "القرآن" رکھا کیونکہ انبیائے ماسبق کے زمانوں میں وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک الہامی کتاب کا بدل اگلے زمانے میں بنی نوع انسان کو کسی دوسری الہامی کتاب یا صحیفے کی صورت میں میسر آ رہا تھا۔ اس لئے ان کتابوں کو اس قدر جامع بنانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی کسی کتاب کو ہمیشہ کے لئے اس حیثیت میں باقی رہنا تھا۔ لیکن ان کے برعکس خاتم الانبیاء ﷺ کے بعد نہ کوئی اور نبی یا رسول آ سکتا تھا اور نہ قرآن کے بعد کوئی آسمانی وحی، چنانچہ ضروری تھا کہ نبوت محمدی ﷺ کو آفاقی، کائناتی، ابدی، کلی، حتمی، قطعی اور آخری بنانے کے لئے ہر اعتبار سے کامل اور جامع بنایا جائے اور اس طرح وہ کتاب جو نبی آخر الزماں ﷺ پر نازل ہوئی اسے بھی عالمگیر اور ابدی بنانے کے لئے اس قدر جامع کیا جائے کہ انسانیت کو سب کچھ اس کتاب کے دامن سے میسر آ سکے اور کسی کو دوسری سمت میں متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے۔ لہٰذا قرآن اپنی جامعیت کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے:۔

يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ○ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ○ (البینہ، ۹۸: ۲-۳)

وہ (ان پر) پاکیزہ اوراق (قرآن) کی تلاوت کرتے ہیں۔ جن میں درست اور مستحکم احکام (درج) ہیں۔

کوئی ضرورت کی چیز جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہو قرآن سے خارج نہیں۔ باوجود قلت حجم کے اس میں وہ تمام علوم و معارف بیان کر دیئے گئے ہیں جن کا احصاء و استیفاء کوئی فرد نہیں کر سکتا تھا۔ خود قرآن اعلان کرتا ہے:۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ (لقمان، ۳۱: ۲۷)

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر ان کی سیاہی۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (یعنی کلام

الٰہی کی وسعت و جامعیت کا احاطہ نہیں ہو
سکے گا) بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا
ہے۔

قرآن مجید کے اسی اعجاز جامعیت اور ابدی فیضان کا ذکر کرتے ہوئے امام جلال الدین سیوطی" شعر نقل کرتے ہیں:۔

کالبدر من حیث التفت رایتہ — یھدی الی عینیک نورا ثاقبا

کالشمس فی کبد السماء و ضوءھا — یغشی البلاد مشارقا و مغاربا

قرآن چودھویں رات کے چاند کی مانند ہے تو اسے جس طرف سے بھی دیکھے وہ تیری آنکھوں کو چمکتا ہوا نور عطا کرے گا۔ یہ قرآن آفتاب کی طرح آسمان کے وسط میں ہے۔ لیکن اس کی روشنی دنیا کے مشارق و مغارب سب کو ڈھانپ رہی ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ امر اچھی طرح آشکار ہو گیا ہے کہ قرآن کی پہلی وجہ تسمیہ اس کی معنوی جامعیت ہے جو آج تک اس شان سے دنیا کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہو سکی۔

لفظ قرآن کا دوسرا مادہ اشتقاق: قرن

لفظ قرآن کا دوسرا مادہ اشتقاق **قرن** ہے جس کے معنی اکٹھا کرنے اور ملانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔

قرن الشئی بالشئی — اس شخص نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملا دیا۔

لہٰذا (الف) القرآن پر قرن کے لغوی معنی کا اطلاق اسطرح ہو گا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی ہر سورت دوسری سورت کے ساتھ' ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ' ہر لفظ دوسرے لفظ کے ساتھ اور ہر حرف دوسرے حرف کے ساتھ اس طرح متصل ہے کہ انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔

امام ابو الحسن اشعری" اور ان کے متبعین اسی نقطۂ نظر کی تائید فرماتے ہیں۔

امام فخرالدین رازی نے امام سفیان ثوری کا ایک قول نقل فرمایا ہے:-

سمی القران قرانا لان الحروف جمعت فصارت کلمات' والکلمات جمعت فصارت آیات' والآیات جمعت فصارت سورا' والسور جمعت فصارت قرانا' ثم جمع فیہ علم الاولین والاخرین	قرآن کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا کہ حروف آپس میں ملائے گئے تو کلمات بنے' کلمات ملائے گئے تو آیات بنیں' آیات ملائی گئیں تو سورتیں بنیں اور سورتیں باہم ملائی گئیں تو قرآن بنا' پھر اس میں اولین و آخرین کے سب علوم جمع کر دیئے گئے۔
(تفسیر کبیر جلد' ۱:۲۳۸)	

(ب) قرن سے ہی "اقتران" ہے جو باب افتعال سے مصدر ہے اور "ازدواج" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جوڑے کے مل جانے اور دو کے اکٹھا ہو جانے (UNION AND CONJUNCTION) کو عربی زبان میں ازدواج کہا جاتا ہے۔ جب تک ازدواجیت رہتی ہے خاوند اور بیوی کی علیحدگی متصور نہیں ہوتی اور جونہی یہ الگ ہوتے ہیں رشتہ ازدواج باقی نہیں رہتا۔ امام راغب اصفہانیؒ المفردات میں فرماتے ہیں کہ ازدواج کی یہی معنویت اقتران میں بھی موجود ہے۔

اس اعتبار سے قرآن کا معنی کسی چیز کے ساتھ اس کتاب کا ایسا اتحاد اور اتصال یعنی اقتران و ازدواج ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ممکن نہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے:-

قرنت البعیر بالبعیر ای جمعت بینھما	میں نے ایک اونٹ کو دوسرے کے ساتھ ملا کر باندھ دیا۔

قرآن کا قرن سے مشتق ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسے کسی وصف کے ساتھ اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو گئے۔

(ج) اسی طرح قرن سے "القران" بھی نکلا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں:-

القران الجمع بین الحج والعمرۃ	قران حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کرنے کا نام ہے۔
(المفردات)	

اس مادے کے تمام مشتقات میں اتصال اور باہم پیوستگی کا مفہوم موجود ہے۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خوبی اور وصف ہے جو قرآن کے ساتھ اس حد تک متصل اور پیوست ہے کہ اس میں اور قرآن میں دوئی یا علیحدگی کا کوئی تصور باقی نہیں رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خوبی "ہدایت اور راستی" ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن سے اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ یہ اس سے جدا نہیں اور وہ اس سے جدا نہیں۔ یعنی قرآن اور راہ ہدایت کے درمیان فرق کرنا ہی ممکن نہیں رہا کیونکہ ان کی باہم پیوستگی کا عالم یہ ہے کہ خود قرآن کو عین "حق و ہدایت" سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ جیساکہ "هُدًى لِّلنَّاسِ" اور "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ قرآن مجید نے اپنے متعدد اوصاف و خصائص بیان کیے ہیں۔ جن کا جائزہ لینے سے ہمیں مذکورہ بالا حقیقت کی مکمل تصریح میسر آجاتی ہے۔

قرآن اور ہدایت کا باہم متصل ہونا

قرآن حکیم سب سے پہلے جس مقام پر اپنا تعارف کراتا ہے وہ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات ہیں:۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ، ۲:۲)

(یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ (یہ) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔

یہاں تعارف قرآن کے سلسلہ میں ایک ہی خوبی کا ذکر ہے اور وہ ہے اس کا ہدایت ہونا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران، ۳:۱۳۸)

یہ قرآن لوگوں کے لیے واضح بیان ہے اور ہدایت ہے اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے۔

اس آیت میں قرآن نے خود کو واضح بیان اور ہدایت کے نام سے تعبیر کیا ہے

اور خود کو موعظت و حکمت کے عنوان سے بھی پیش کیا ہے۔

تیسرے مقام پر قرآن مجید اپنا تعارف یوں کراتا ہے:۔

فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف ۷: ۵۲)

ہم نے (اس قرآن کو اپنے) علم (کی بنا) پر مفصل کیا وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

اس جگہ قرآن حکیم نے اپنے آپ کو مفصل علم کہا ہے اور اہل ایمان کے لیے خود کو سراسر ہدایت و رحمت کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن اپنا تعارف یوں کراتا ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (یونس ۱۰: ۵۷)

اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور ان (بیماریوں) کی شفا آگئی جو سینوں میں (پوشیدہ) ہیں اور ہدایت اور اہل ایمان کے لئے رحمت بھی۔

یہاں قرآن مجید نے خود کو موعظت، شفاء، ہدایت اور رحمت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:۔

تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (یوسف ۱۲: ۱۱۱)

(قرآن تو) ان (آسمانی کتابوں) کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) ہیں۔ اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ہدایت ہے اور رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایمان لے آئے۔

یہاں تفصیل، تصدیق اور اہل ایمان کے لیے ہدایت و رحمت کے اوصاف گنوائے گئے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۝ (النحل ۱۶: ۸۹)	اور ہم نے آپ پر وہ عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۝ (الجاثیہ ۴۵: ۲۰)	یہ نسل انسانی کے لیے بصیرت و تنبیہہ ہے اور ہدایت و رحمت ہے یقین والوں کے لیے۔

مذکورہ بالا سب آیات کا جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن ہر جگہ اپنی خصوصیات اور حیثیات کا عنوان بدلتا رہا ہے لیکن ایک حیثیت شروع سے آخر تک بلا استثناء مذکور ہوتی چلی گئی ہے اور وہ "ہدایت" ہے قرآن کی مختلف حیثیتوں کا یہ عالم ہے کہ یہ گمراہوں کے لیے ہدایت ہے' نہ جاننے والوں کے لیے علم ہے' غافلوں کے لیے موعظت و نصیحت ہے' کم فہموں کے لیے واضح بیان ہے' بیماروں کے لیے شفا ہے' مایوسوں کے لیے بشارت ہے' پریشان حال لوگوں کے لیے رحمت ہے' سابقہ انبیاء کی تعلیمات اور ان کی نبوتوں کے لیے تصدیق ہے' ابہام و اجمال کے لیے تفصیل ہے اور مجرموں اور ظالموں کے لیے تنبیہہ و بصیرت ہے۔ الغرض قرآن کی مختلف حیثیتیں نسل انسانی کے مختلف طبقات کی ضرورتوں اور تقاضوں کے اعتبار سے ہیں۔ لیکن قرآن شفاء ہو یا نصیحت' رحمت ہو یا موعظت' تصدیق ہو یا تفصیل علم ہو یا تنبیہہ' اس کا ہدایت ہونا ہر حیثیت میں یکساں طور پر کار فرما ہے۔ اسی لیے اس مقدس کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ ۲: ۲)	یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

یعنی ہم نے اس کتاب کے ساتھ اپنی ہدایت اور رہنمائی کو اس طرح متحد کر دیا ہے کہ ہدایت سراسر قرآن اور قرآن سراسر ہدایت ہو گیا ہے۔ یہی لفظ قرآن کی

وجہ تسمیہ ہے۔ اس لیے قرآن سب سے پہلا دعویٰ ہی یہی کرتا ہے کہ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

قرآنی ہدایت، کا دائرہ اثر

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مقدس کتاب سے ہدایت صرف وہی لوگ حاصل کر سکیں گے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے زیور سے آراستہ ہوں یا عاصی اور خطاکار بھی قرآنی ہدایت سے استفادہ کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب یوں ملتا ہے:۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ۲:۱۸۵)

رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور (جس میں) رہنمائی کرنے والی اور (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والی واضح نشانیاں ہیں۔

قرآن اپنے مقصد نزول کے تعارف کی نسبت سے تین جملے بیان کر رہا ہے اور تینوں جملے درحقیقت ہدایت ہی کے تین مدارج و مراحل ہیں۔ پہلے فرمایا **"هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ"** کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے ایک عام انسان کے ذہن میں خلش پیدا ہوئی کہ "کیا قرآن سے پرہیزگاروں کے سوا عام انسان کو ہدایت میسر نہیں آسکتی"؟ تو قرآن نے جواب دیا۔ **"هدی للناس"** یہ نسل انسانی کے ہر فرد کے لیے بھی ہدایت ہے۔ یہاں ہدایت سے مراد وہ روشنی ہے جس سے منزل مقصود کا تعین ہو سکے۔ قرآن نے اس کے بعد کہا کہ یہ صرف ہدایت کا دعوی ہی نہیں بلکہ **"وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی"** یہ دعویٰ ہدایت کی دلیل بھی ہے۔ کیونکہ اس میں ہدایت کی روشن دلیلیں اور واضح ثبوت ہیں۔ گویا دعوے کے ساتھ اپنی صحت اور حقانیت کی دلیلیں بھی قرآن میں ہی موجود ہیں۔ اس کے بعد فرمایا **"والفرقان"** یعنی یہ ایسی ہدایت نہیں جس کے مل جانے کے بعد بھی حق و باطل میں سمجھوتے کا کوئی تصور باقی رہ سکے۔ یہ ایسی رہنمائی نہیں جس کے

میسر آجانے کے بعد خیر و شر میں امتیاز نہ ہو سکے۔ ہم ایسی رہنمائی کو ہدایت ہی نہیں سمجھتے جو حق و باطل کے درمیان تفریق اور خیر و شر کے درمیان حد فاصل قائم نہ کر سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ میری ہدایت وہ ہدایت ہے جس کے آجانے کے بعد حق 'حق ہو جاتا ہے اور باطل 'باطل۔ پھر کسی اعتبار سے بھی خیر و شر اور صدق و کذب میں نہ کوئی امتزاج باقی رہتا ہے اور نہ اتحاد و یگانگت۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے اعلان فرمایا:۔

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا○ (بنی اسرائیل '۱۷:۸۱)

حق آگیا اور باطل بھاگ گیا۔ بیشک باطل نے زائل و نابود ہی ہو جانا ہے۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (الانفال '۸:۸)

تاکہ حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل کر دے بیشک مجرم ناپسند کرتے رہیں۔

مزید ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم '۱۴:۱)

ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف اس لیے نازل فرمائی ہے کہ آپ انسانیت کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کے) نور کی طرف لے آئیں۔

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے:۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل '۱۷:۹)

بیشک یہ قرآن اس (منزل) کی رہنمائی کرتا ہے جو سب سے درست ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن نے اپنے ہدایت ہونے کے ضمن میں فرمایا ہے:۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ (الزمر '۳۹:۴۱)

یارسول اللہ ﷺ ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے۔ پس جو کوئی اس قرآن سے ہدایت پائے گا اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچے گا۔

قرآنی ہدایت ہر سطح پر خوف و غم سے نجات کی ضامن بھی ہے۔ اس وصف

ہدایت کا بیان یوں کیا گیا ہے:۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (البقرہ ۲:۳۸)

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ ان پر کوئی خوف (طاری) ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ایک اہم نکتہ

یہاں ایک اہم حقیقت کا بیان ضروری ہے کہ قرآنی فکر کے بعض علم برداروں نے قرآنی ہدایت کو اس طرح محصور و محدود کر دیا ہے کہ قرآن کی ہدایت انسان کو آخرت کے خوف و غم سے تو محفوظ کر سکتی ہے مگر اس دنیا کے خوف و غم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت اپنے دامن میں نہیں رکھتی حالانکہ "بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (البقرہ ۲:۳۶) اس دنیا میں تمہاری آپس کی عداوتیں ہونگی، باہمی بغض و عناد ہو گا لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں گے لیکن یہ دشمنی اور عداوت کس بنیاد پر ہو گی؟ فرمایا:۔

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (البقرہ ۲:۳۶)

تمہیں ایک خاص مدت تک اس زمین پر رہنے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کا حق دے دیا گیا ہے۔

تم میں سے کچھ لوگ چاہیں گے کہ دوسروں سے جینے کا حق چھین لیا جائے۔ مستحکم ہونے کا حق بھی سلب کر لیا جائے۔ جب کہ کچھ لوگ چاہیں گے کہ انسانیت کے یہ حقوق بتمام و کمال محفوظ رہیں۔ گویا حق و باطل کے درمیان یہ ٹکراور محاذ آرائی جاری رہے گی حق و باطل کا یہ معرکہ نسل انسانی کو خوف و غم کی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کر دے گا۔ لیکن بنی آدم کو خوف و غم کی اس محیط کیفیت سے دنیا کا کوئی نظام نجات نہیں دے سکے گا سوائے ہدایت ربانی کے۔ تعجب ہے کہ انسانی زندگی کو خطرات و خدشات تو اس دنیا میں درپیش ہوں جبکہ قرآن کی ہدایت صرف آخرت میں ہی خوف و غم سے

نجات دینے کا وعدہ کر [illegible] یقیناً [illegible] (معاذ اللہ) شیطان نے خدا کو شکست دے دی۔ رہا آخرت کا حال تو وہ آخرت میں دیکھا جائے گا۔ (معاذاللہ، استغفراللہ) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی وہ ہدایت جو آخرت کے خوف و غم سے نجات دے سکتی ہے اس سے پہلے اس دنیا کے ہر خوف و غم سے نجات دینے کی بھی ضامن ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ قرآن خود ایسی ہدایت ہے جو دنیوی اور اُخروی ہر قسم کے خوف و غم سے نجات دلانے کی ضامن ہے اب رہا یہ سوال کہ شاید قرآن صرف انفرادی سطح کی ہدایت مہیا کرتا ہے۔ اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کی نہیں ہرگز نہیں یہ ایک فرد کی نجی زندگی سے لے کر قوم کی اجتماعی اور انسانیت کی عالمی زندگی تک کی ہدایت کا ضامن ہے۔

انفرادی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○ (المزمل ۷۳:۱۹)

یہ قرآن ایسا ضابطہ نصیحت اور ہدایت کا چارٹر ہے کہ جس شخص کا جی چاہے اس کا دامن تھام کر خدا کی راہ کو پالے۔

قومی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ

(الزخرف ۴۳:۴۴)

یا رسول اللہ! یہ قرآن آپ کے لئے اور آپ کی پوری قوم و ملت کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔

عالمی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ

(الانعام ۶:۹۰)

یہ قرآن تمام عالم کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔

مذکورہ بالا شواہد سے یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ قرآن سے جو ہدایت حاصل ہوتی ہے وہ صرف نجی زندگی کے لئے نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے تمام احوال پر بھی محیط

ہے۔ گویا قرآن اور ہدایت کا یہ اتحاد انسانیت کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اے راہ حق کے متلاشیو! اگر حق کی تلاش ہے تو قرآن کا دامن تھام لو۔ اس لئے کہ حق و ہدایت صرف قرآن کے ساتھ پیوست اور مختص ہے۔ یہی اعلان در حقیقت لفظ قرآن کا دوسرا معنیٰ ہے۔

ہدایت کے مدارج و مراتب

قرآن جس ہدایت کا تصور دیتا ہے اس کے تین درجے ہیں :۔

۱۔ **عرفان الغایۃ**

۲۔ **ارائۃ الطریق**

۳۔ **ایصال الی المطلوب**

راستہ دیکھنے کی طلب اور دکھانے کی ضرورت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک منزل کا شعور اور تعین نہ ہو۔ اس لئے ہدایت کا پہلا درجہ **عرفان الغایۃ** (منزل کی معرفت) ہے۔

غرض و غایت اور منزل مقصود کا تعین ہو جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ یہاں ہدایت کے دوسرے درجے **ارائۃ الطریق** (راستہ دکھانا) کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے ذریعے راستے کی رہنمائی ملتی ہے۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ اگر ایک شخص آپ کو منزل کا راستہ بتا دے اور منزل بہت دور ہو تو صرف راستہ بتا دینے میں کیا ضمانت ہے کہ آپ یقیناً منزل کو پا لیں گے۔ ممکن ہے آپ آگے جا کر بھٹک جائیں۔ گویا راستہ بتا دینا ہدایت تو ہے لیکن ہدایت ناقصہ ہے کاملہ نہیں۔ اس لئے قرآن تیسرے درجے کی ہدایت بھی مہیا کرتا ہے جسے **ایصال الی المطلوب** (منزل تک پہنچا دینا) کہتے ہیں۔ گویا قرآن اور ہدایت کا باہمی تعلق یہ ہے کہ منزل کا تعین کر دینے اور راستہ دکھا دینے کے بعد قرآن آپ سے لاتعلق نہیں ہو جاتا بلکہ ایسی ہدایت بھی مہیا کرتا ہے جو آپ کا بازو پکڑ کر منزل تک پہنچا دے۔ قرآنی ہدایت کا عالم یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی زندگی کے مقصد کا تعین درکار ہو تو

یہ اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر کسی کو راستے کی تلاش ہو تو یہ اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور اگر مقصد تک پہنچنا درکار ہو تو قرآنی ہدایت مقصد تک پہنچانے کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔

ہدایت کے ان تینوں مدارج کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ	جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے اس کے
(التغابن '۶۴: ۱۱)	دل کو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔

یہ ہدایت کا پہلا درجہ ہے جسے **عرفان الغایہ** یعنی شعور مقصد اور منزل کی معرفت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر ہدایت کے دوسرے درجے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی
(البقرہ '۲: ۱۴۲)	طرف ہدایت دے دیتا ہے۔

یہ دوسرے درجے کی ہدایت تھی جو صرف راستہ دکھانے سے متعلق ہے۔

تیسرے درجے کی ہدایت کی نسبت قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا	تمام تعریف اس رب کی ہے جس نے
(الاعراف '۷: ۴۳)	ہمیں اس منزل تک پہنچا دیا۔

گویا قرآن ہر درجہ ہدایت کے اعتبار سے انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن نسل انسانی کے ہر طبقے کو دعوت دے رہا ہے کہ جس طرح کی رہنمائی کی ضرورت ہو مجھ سے حاصل کر لو کیونکہ شعور نصب العین کی بیداری بھی تمسک بالقرآن سے ممکن ہے اور حصول منزل بھی اسی سے۔ آج مشرق و مغرب کی جملہ اقوام بالعموم جس تشتت و افتراق 'اضطراب والتہاب اور اخلاقی بے راہروی کا شکار ہیں قرآنی ہدایت سے فیضیاب ہوئے بغیر اس سے نجات نہیں پا سکتیں۔ ملت اسلامیہ 'جس کا اعتماد اس دور زوال میں قرآنی ہدایت کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی پر بحال نہیں رہا۔ افکار اغیار کی دریوزہ گری کرنے لگی ہے قرآن کا نام لینے والے اس دنیا کے لئے قرآن کو عملاً

[illegible] ہو چکی ہیں اور نتیجتاً قرآنی فکر کو احقاق حق کے بجائے باطل سے سمجھوتے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ اگر حق اور باطل کا صحیح امتیاز پیش نظر رکھ کر ہر قسم کی ہدایت فی الواقع قرآن ہی سے طلب کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کھویا ہوا وقار بحال نہ کرا سکے۔

قرآن پڑھنے کے باوجود گمراہی کا امکان

قرآن صحیفہ ہدایت ہے لیکن ملت اسلامیہ میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو قرآنی فکر کا نام لے کر بھی اس سے دور جا رہے ہیں اور قرآن پڑھ کر بھی گمراہی کے راستوں پر چل رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں قرآن ہی سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ہو گا۔ کیونکہ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں بیشمار طبقے ایسے ہو گزرے ہیں جو بکثرت قرآن پڑھتے تھے لیکن علی التحقیق گمراہ قرار دیئے گئے۔ مثلاً خوارج' معتزلہ' مرجئہ' باطنیہ وغیرہم۔ یہ سب قرآن سے استدلال کرتے تھے۔ مگر ظاہراً تمسک بالقرآن کے باوجود گمراہ ہو گئے۔ آج بھی مسلمانوں میں فکری سطح پر اٹھنے والی کئی الحادی اور انحرافی تحریکات اپنے اپنے نقطۂ نظر کو قرآن ہی سے ماخوذ قرار دیتی ہیں لہٰذا قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا محض دعوی کسی کے لیے سند صحت و صداقت نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے میں کئی ایسے فتنوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں بعض لوگوں کو قرآن اور عبادات سے ظاہری تمسک کے باوجود لادین اور گمراہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنی فکر و دانش کو حرف آخر اور عقل کل سمجھتے ہیں اور ہر بات کی صحت و عدم صحت یا حق و بطلان کا فیصلہ صرف اپنی رائے سے کرتے ہیں' وہ بدنصیب قرآن پڑھ سن کر بھی قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن دانی صرف اپنے افکار ذہنی کی تائید اور اپنی خواہشات نفسانی کی تسکین سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا ظاہراً کثرت سے قرآن پڑھنا' ہدایت یافتہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے باطنی فسق اور ذہنی آمریت کے باعث قرآن کے اسی حکم سے جس سے اہل اطاعت ہدایت

پاتے ہیں، گمراہی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہی کی نسبت ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَيُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖ إِلَّا الْفٰسِقِينَ (البقرہ ۲:۲۶)

اور وہ اسی سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے۔ اس سے انہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو پہلے ہی فاسق ہیں)

یہ امر ذہن نشین رہے کہ فسق بعض اوقات نماز، روزہ اور تلاوت قرآن کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

فان له اصحابا يحقر احدكم صلوته مع صلوتهم و صيامه مع صيامهم يقرون القران لا يجاوز تراقيهم يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية (بخاری ۲:۱۰۲۴)

بیشک اس کے ساتھی ایسے ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازوں کو حقیر اور قلیل جانو گے اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ وہ قرآن (کثرت سے) پڑھیں گے مگر ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ لوگ دین سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر کمان سے۔

ایک اور مقام پر انہی لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

السنتهم احلى من السكر و قلوبهم قلوب الذئاب (ترمذی ۲:۶۳)

ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی مگر ان کے دل بھیڑیوں کے ہوں گے۔

قرآن سے غلط استدلال کر کے گمراہ ہونے والے علماء کی نشاندہی بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

عن حذیفۃ ابن الیمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان مما اتخوف علیکم رجل قرا القران حتی اذا رویت بھجتہ علیہ و کان رداوہ الاسلام' اعتراہ الی ماشاء اللہ انسلخ منہ ونبذہ وراء ظھرہ وسعی علی جارہ بالسیف و رماہ بالشرک قال قلت یا نبی اللہ ایھما اولی بالشرک المرمی اوالرامی قال بل الرامی

(تفسیر ابن کثیر' ۲:۲۶۵)

حضرت حذیفہؓ بن یمان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے جن امور کا خدشہ ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ایسا آدمی (عالم) ہو گا جو قرآن بہت پڑھے گا۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کی رونق سے پورے طور پر سیراب ہو گا۔ اس کا اوڑھنا بچھونا بھی اسلام ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اسے کسی ایسے عیب یعنی زعم میں مبتلا کر دے گا کہ قرآنی اثرات اس سے جدا ہو جائیں گے۔ پھر وہ شخص قرآن کو پس پشت ڈال کر اپنے قرب و جوار کے مسلمانوں کو مشرک قرار دے گا اور ان کے قتل کے درپے ہو گا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سوال کیا: یارسول اللہ ﷺ ان دونوں میں سے فی الواقع مشرک کون ہو گا' مشرک کہنے والا یا وہ جس کو مشرک کہا گیا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دوسرے کو مشرک کہنے والا خود مشرک ہو گا۔

یہ حدیث مسند امام ابو یعلی میں راویت کی گئی ہے۔ امام احمد بن حنبل' امام یحیٰ بن معین اور دیگر ائمہ و محدثین نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے۔ الغرض اس حدیث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے کے

باوجود قرآن سے غلط استدلال کر کے امت محمدی ﷺ کو گمراہ اور مشرک ٹھہرائیں گے حالانکہ یہی سوچ ان کی اپنی گمراہی ہوگی۔ کیونکہ باطن میں فسق ہو اور سینہ و دل انوار معارف قرآنی سے خالی ہوں تو قرآن کا مطالعہ بھی ایسے بد نصیبوں کے لئے گمراہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

اس حقیقت کی تائید حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے:۔

و کان ابن عمر یراهم شرار خلق الله و قال انهم انطلقوا الی آیات نزلت فی الکفار فجعلوها علی المومنین

(بخاری، ۲: ۱۰۲۴)

ابن عمران لوگوں کو مخلوق خدا میں سب سے زیادہ شریر تصور کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ ان قرآنی آیات کو جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں بڑی آزادی اور جرات مندی کے ساتھ مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ ہمیشہ کچھ لوگوں کا طریق کار یہ رہا ہے کہ پہلے اپنے خود ساختہ فکر اور مزعومہ مفادات کے تحت عقائد تراش لیتے ہیں اور پھر قرآنی آیات کو تاویل و تحریف کے ذریعے اپنے وضع کردہ خیالات اور نقطہ ہائے نظر پر منطبق کرنے کا نام تفسیر اور فکر قرآن رکھ دیتے ہیں۔ گویا خود قرآن کے تابع نہیں بلکہ قرآن کو اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔

یہی حال بنی اسرائیل کے بعض علماء کا بھی تھا، جن کی قرآن حکیم میں یوں مذمت کی گئی ہے:۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ

(البقرہ، ۲: ۷۵)

ان میں سے ایک گروہ کے لوگ ایسے (بھی) تھے کہ اللہ کا کلام (تورات) سنتے پھر اسے سمجھنے کے بعد (خود) بدل دیتے۔

ایسے لوگوں کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے آیات کی

تلاش رہتی ہے اور انہی کے حوالے سے اپنے موقف کی تائید کو خدمت قرآن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اس سلسلے میں ابو عثمان النہدی کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ بنی یربوع یا بنی تمیم میں سے ایک شخص نے آپ سے **الزاریات و المرسلات و النازعات** یا ان میں سے بعض کے متعلق سوال کیا' یہ استفسار ظاہراً قرآن فہمی کی خاطر ہی تھا۔ لیکن آپ نے فرمایا:

ضع عن راسک' فاذالہ وفرۃ فقال عمر اما واللہ لرایتک محلوقا لضربت الذی فیہ عیناک

(الصارم المسلول:۱۸۸)

اپنے سر سے کپڑا ہٹا اس نے سر ننگا کیا تو سر پر بال تھے۔ (یعنی سر منڈا ہوا نہ تھا) آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر یہ سر منڈا ہوا ہوتا تو میں اسے قلم کر دیتا۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ اس شخص نے سوال تو قرآن مجید کی سورتوں کا معنی و مفہوم جاننے کے لئے کیا تھا۔ اس سے اس کا قرآنی تعلیمات اور ان کی تفہیم سے لگاؤ ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن سیدنا فاروق اعظمؓ کا رد عمل کچھ اور نکلا۔ وجہ یہ تھی کہ اس دور میں ایسے لوگ موجود تھے جو بکثرت قرآن پڑھتے تھے اور اس کے فہم و بیان کا دم بھی بھرتے تھے۔ لیکن ارشادات رسول ﷺ کی روشنی میں ارباب بصیرت اور صحابہ کبار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان لوگوں کا تمسک بالقرآن محض دھوکہ و فریب ہے۔ قرآن ان کی زبانوں پر ہے سینوں میں نہیں اور یہ اس قسم کے استفسارات خاص زاویہ نگاہ سے کرتے ہیں' ان کا ارادہ کچھ اور ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں کی علامات بھی بیان فرما دی تھیں۔ یہ خوارج ہی تھے جو اسلام اور قرآن ہی کے نام پر ملت اسلامیہ کو تفرقہ و انتشار میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کا مطمع نظر بجائے کفار و مشرکین سے بر سرپیکار ہونے کے خود صحابہ' تابعین اور امت مسلمہ کے سواد اعظم کو کافر و مشرک قرار دے کر ان سے محاذ آرائی اور قتل و غارت تھا۔ اسلام کی پہلی صدی کی تاریخ اور بالخصوص دور خلافت علیؓ کے حقائق و واقعات ان شواہد پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کی علامات میں سے بالعموم

(حدیث نبوی کے مطابق) [illegible] ہوئی [illegible] نہیں، ابھرے ہوئے گال [illegible] کے اوپر تہبند، گھنی داڑھی اور سر منڈوانا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس سائل کی نسبت یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ خارجی ہو۔ اس لئے اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر اسے سر ننگا کرنے کو کہا لیکن سر منڈا ہوا نہ دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے خارجی نہ ہو۔ لہٰذا یقین کے بغیر اسے قتل نہیں کیا۔ تاریخی شواہد سے یہ امر ثابت ہے کہ **ان الحکم الا للّٰہ** (حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے) اور **لا حجۃ الا القرآن** (قرآن کے سوا کوئی چیز حجت نہیں) جیسے نعرے جو بظاہر بڑی دینی حمیت پر دلالت کرتے ہیں، خود اسلام میں فتنہ و شر پیدا کرنے کے لئے لگائے جاتے رہے ہیں۔ اگر خدا اور قرآن کے نام پر تاریخ اسلام کے دور اوائل میں گمراہی پھیلانے کی کوشش ہوتی رہی ہیں تو آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد جب کہ اخلاقی اقدار بھی زوال و انحطاط کا شکار ہو چکی ہیں ایسے فتنوں سے سادہ لوح مسلمانوں کو دام فریب میں کیوں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن سے ہدایت پانے کا حتمی طریقہ

اندریں حالات یہ ضرورت زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اہل اسلام کو راہ ہدایت پر گامزن ہونے اور گمراہی و ضلالت سے محفوظ رہنے کی کوئی حتمی سبیل معلوم ہونی چاہیے تاکہ وہ مختلف قسم کے دلفریب اور خوشنما دعووں سے متاثر ہو کر جگہ جگہ بھٹکتے نہ پھریں۔ آیئے ہم قرآن سے اس اصول اور ضابطے کو تلاش کرتے ہیں جسے اپنا کر اخذ ہدایت کی ضمانت میسر آ جائے۔ قرآن حکیم اس سوال کا جواب کہ کون سی راہ ہدایت ہے سورۃ الفاتحہ میں مرحمت فرماتا ہے۔ یہ وہ سورت ہے جس نے انسانوں کو رب ذوالعطا سے مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اس لئے اسے سورۃ الدعا، سورۃ السوال او تعلیم المسئلہ بھی کہتے ہیں۔

قرآن حکیم کی سب سے پہلی آیت جو طلب ہدایت اور راہ ہدایت کی نشاندہی سے متعلق ہے اسی سورت میں ہے۔ خدا کی حمد و ثناء کے بعد انسان کو بارگاہ ایزدی میں یہ سوال کرنے کی تعلیم دی گئی ہے:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ (اے اللہ) ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

(الفاتحہ '۱:۵)

اب سوال یہ ہے کہ سیدھی راہ کا تعین کس طرح ہوگا۔ یہ کون بتائے گا کہ یہ راستہ سیدھا ہے۔ قرآن نے خود صراط مستقیم کی تعریف کر کے ہمیشہ کے لئے اس الجھن کو ختم کر دیا ہے:۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ○

(الفاتحہ '۱:۷)

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ (ہی) گمراہوں کا۔

یہاں صراحت کے ساتھ خدا کے مقبول اور انعام یافتہ بندوں کے راستے کو راہ ہدایت سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس قرآنی وضاحت سے اختلاف کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی، لیکن انعام یافتہ بندوں کا تعین پھر مسئلہ پیدا کر سکتا تھا۔ قرآن نے اس کو بھی یہ کہہ کر حل فرما دیا:۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا

(النساء '۴:۶۹)

اور جو کوئی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو یہی لوگ (روز قیامت) ان (ہستیوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (خاص) انعام فرمایا جو کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔

اس آیت میں خدا کے انعام یافتہ بندوں کو چار طبقات پر منقسم کر دیا گیا ہے، نبی، صدیق، شہید، اور صالح۔ گویا نبوت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت یہ چار اوصاف ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعام کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

لہٰذا "صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی قرآنی تفسیر یہ ہوئی کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء کا راستہ چونکہ خدا کے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے، اس لئے یہی راہ ہدایت ہے۔ قرآن حکیم کے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مذکورہ بالا

چاروں طبقات کا راستہ دراصل ایک ہی راستہ ہے۔ ان میں قطعاً کوئی تفاوت اور مغائرت نہیں اور یقیناً یہی کتاب و سنت کا راستہ ہے۔

راہ ہدایت کا قرآنی تشخص

قرآن نے اس مقام پر راہ ہدایت کی تعریف کتاب و سنت کے الفاظ کے حوالے سے نہیں کی حالانکہ متعدد دیگر مقامات پر اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کے الفاظ کی صورت میں کتاب و سنت سے تمسک و اعتصام کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیونکہ اسلام میں معیار حق و صداقت تو بلاشک و شبہ کتاب و سنت کی راہ ہی ہے اور کسی چیز کو ان کا بدل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہاں اہل اسلام کو طلب ہدایت کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے اور انہیں راہ ہدایت پر گامزن ہونے کا یقینی ضابطہ بتلانا مقصود ہے۔ یہاں بھی احکم الحاکمین صاف لفظوں میں یہ فرما سکتا تھا کہ سیدھا راستہ میری کتاب اور میرے رسول ﷺ کی سنت کا ہے۔ لیکن بجائے اس کے یہ کہا گیا کہ سیدھا راستہ میرے انعام یافتہ اور مقبول بندوں کا راستہ ہے۔ ذرا غور کریں تو آپ کو صراط مستقیم کی تعریف میں دو پہلو نظر آئیں گے۔ مثبت اور منفی۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مثبت راہ کی نشاندہی ہے، جب کہ **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ** منفی راہ کی۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور مانعیت بھی۔ اس قدر تفصیل میں جانے کے بجائے صاف صاف قرآن و سنت کے الفاظ استعمال ہوتے تو اس میں اختصار بھی ہوتا اور ایجاز بھی، لیکن ان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ، **فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ** (صاحب حکمت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا) اس میں حکمت یہ ہے کہ راہ ہدایت ہے تو فی الحقیقت قرآن و سنت ہی کا راستہ لیکن قرآن و سنت کا صحیح مدعا و منشاء خدا کے انعام یافتہ، مقبول اور صالح بندوں کی پیروی سے ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ محض اپنی رائے سے قرآن و سنت کے مطالب و مفاہیم متعین کرنے میں گمراہی کا امکان پایا جاتا ہے۔ یہی اس آیت کا منشاء ہے۔ **يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا** یعنی جو لوگ صرف اپنی رائے سے قرآن اور اس کی تمثیلات کو سمجھنا چاہتے ہیں گمراہ ہو جاتے ہیں اور جو اللہ کے انعام یافتہ بندوں کی رہنمائی سے

سمجھنا چاہتے ہیں ہدایت پا جاتے ہیں۔

گویا ارشاد ربانی کے مطابق قرآن سے محض اپنی رائے کی بناء پر اکتساب علم کرنے والے گمراہی و ضلالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث رسول ﷺ سے بھی ہوتی ہے:۔

من قال فی القرآن برایہ فقد اخطاء — جس نے قرآن کا مفہوم اپنی ذاتی رائے سے متعین کیا، اس نے ٹھوکر کھائی۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

اس لئے مشیت ایزدی یہ تھی کہ الہامی ہدایت کے ساتھ ساتھ اس ہدایت کے مشخص نمونے بھی بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کئے جائیں تاکہ لوگ خدا کے پیغام کو اسی کی منشاء کے مطابق سمجھ سکیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو ہدایت ربانی کا کامل نمونہ بنا کر مبعوث کیا جاتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد ربانی کا یہی مقصود تھا:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — بے شک تمہارے لئے رسول اللہ میں پیروی کے لئے بہترین نمونہ حیات ہے۔ (الاحزاب، ۳۳:۲۱)

بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی، حقیقی اسلام، حقیقی ایمان اور حقیقی تمسک بالکتاب بغیر کسی زندہ شخصیت کے توسط کے کیونکر ممکن ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ بایں ہمہ یہ نہ ہوا کہ قرآن براہ راست بندوں کے پاس پہنچ جاتا۔ منکرین و مومنین اسے آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے اور لوگوں کو بلاواسطہ ہدایت عطا ہو جاتی۔ ہر شخص کے سرہانے صبح کو قرآن کا ایک ایک نسخہ رکھا ہوا مل جاتا لیکن قدرت نے اس کے برعکس انسانی معاشرے میں ایک زندہ شخصیت کو پیدا فرمایا۔ اسے معاشرتی زندگی میں ہر قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم صادر فرمایا اور پھر اس کی وساطت سے لوگوں کو ہدایت بہم پہنچائی۔ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو قرآنی ہدایت سمجھنے کا اہل بنانے کے لئے ان پر آیات تلاوت کیں۔ ان کا تزکیۂ نفوس کیا۔ پھر انہیں تعلیم کتاب دی اور حکمت و دانائی کی دولت سے نوازا۔ قرآن اس طریقہ تعلیم و تربیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

يتلوا عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة

(آل عمران ۳: ۱۶۴)

رسول ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کے قلب و باطن کا تزکیہ فرماتے ہیں اور پھر انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

صحابہ کرام کے سامنے قرآنی ہدایت کا مشخص نمونہ بھی تھا اور جملہ تفصیلات معلوم کرنے کا ذریعہ بھی۔ جسے سنت رسول کہا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے بھی کتاب و سنت کا پیغام نسل انسانی تک پہنچانے کے لئے ایسے نہ کیا کہ قرآن و حدیث کے بیشمار قلمی نسخے دیگر بلاد و امصار میں روانہ فرما دیتے تاکہ لوگ براہ راست قرآن اور سنت رسول ﷺ کے مطالعہ سے تعلیمات اسلام کا صحیح شعور پیدا کر لیتے بلکہ آپ نے بھی سنت الہیہ پر عمل کرتے ہوئے مزید زندہ شخصیات کو پیدا فرمایا۔ ان کے سینے نور معرفت سے منور کئے' انہیں اپنے نور صحبت سے مستنیر کیا' انہیں اپنے فیضان نظر سے اسلام کو سمجھنے کا اہل بنایا اور پھر اطراف و اکناف عالم میں روانہ کر دیا کہ لوگ قرآن و سنت کی تعلیمات ان زندہ شخصیتوں سے سیکھیں۔ یہ صحابہ' تابعین اور تبع تابعین جو قرآن و سنت کی صحیح راہ بتانے والے تھے' یقیناً انکی استعداد آج کے علماء سے بہت زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود زندہ شخصیتوں کے محتاج تھے۔ قرآن و سنت کا علم رکھتے ہوئے بھی اکابر صحابہ و اہل بیت کی خدمت میں جاتے تھے اور یہی طریقہ بعد کے ادوار میں بھی ہمیشہ جاری رہا۔ ہر دور کے علماء قرآن و سنت کو ہی راہ ہدایت سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا اصل تعین اور تشخص انہیں ائمہ و صالحین اور اکابر مجتہدین کے ذریعے ہی حاصل ہوتا تھا۔

مادی علوم میں آج کونسا علم اور دستکاری کے پیشوں میں آج کونسا پیشہ ہے جس میں استاد کی مدد اور ماہرین کی تحقیقات و تشریحات کی ضرورت نہیں۔ کیا قرآن و سنت کا علم ہی ایسا رہ گیا ہے جس میں بغیر اکابر علماء محققین اور صلحاء عاملین کی رہنمائی کے ہر کوئی اپنی رائے سے کلام کرتا پھرے۔ چونکہ اکابر ملت اور صلحاء امت قرآن و سنت سے ماخوذ ہدایت کے علمی و عملی نمونے تھے' اس لئے انکے راستے کو قرآن نے راہ

جس طرح صحابہ نے قرآن کو براہ راست اللہ تعالی سے حاصل نہ کیا تھا اور نہ ہی اس کے نزول کو دیکھا تھا بلکہ انہیں اس کا حصول اور صحیح ادراک و معرفت نمونہ نبوت کی وساطت سے نصیب ہوئی تھی اور جو اندیشہ ہدایت قرآنی کے عملی نمونے کے بغیر براہ راست مطالعہ قرآن سے اخذ ہدایت کی کوشش میں موجود تھا' وہی اندیشہ عہد رسالت کے بعد قیامت تک سنت نبوی کے کامل عملی نمونوں کے بغیر تفسیر بالرائے سے بھی ممکن ہے کیونکہ بعد کے ادوار کے مسلمانوں نے بھی نبی اکرم ﷺ کے قول و عمل اور اس کے مدعا کو براہ راست آپ سے حاصل نہیں کیا بلکہ بصورت مطالعہ اس سے آگہی حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن و سنت کے ہزاروں مسائل کا مفہوم تعبیر و تشریح کے ذریعے ہی متعین ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسا ضابطہ اور اسلوب مقرر کر دیا جاتا جس سے قرآنی ہدایت کا اخذ و حصول اندیشۂ ضلالت سے محفوظ ہو جائے اور امت مسلمہ کتاب و سنت کی ایسی تعبیرات کو اپنا سکے جو بالیقین حق و صواب ہوں۔ اس طرح قرآن مجید نے الہامی ہدایت کا صحیح راستہ قیامت تک کے لئے متعین فرما دیا کہ ہر دور کے مقبول اور انعام یافتہ بندے اسی راہ پر چلتے رہے ہیں۔ چونکہ ان کا علم و عمل دراصل کتاب و سنت کا صحیح نمونہ ہے اس لئے انہی کے راستے پر چل کر قرآن سے ہدایت طلب کی جائے۔ قرآن نے یہ فیصلہ دے کر امت محمدی کو فکری اضطراب و انتشار کے عذاب سے نجات دلا دی ہے کہ جس طرح قرآنی ہدایت اسوہ رسول ﷺ کی صورت میں مشخص کر دی گئی ہے اسی طرح کتاب و سنت کا راستہ امت مسلمہ کے اکابر صلحاء کے راستے سے متعین و مشخص کر دیا گیا ہے۔

اس لئے فرمایا گیا کہ اے راہ ہدایت کے متلاشیو! میرے انعام یافتہ بندوں انبیاء' صدیقین' شہداء اور صلحاء کے راستے پر گامزن ہو جاؤ' یہی راہ حق پرستی ہے۔ آج بعض ذہن اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر یوں سوچنے لگتے ہیں کہ شاید صلحاء امت کے عقائد و اعمال کا راستہ قرآن و سنت کے راستے سے الگ ہے۔ کیونکہ اکابر ائمہ و صالحین کی تحقیقات' تعبیرات اور تشریحات سن کر وہ یہ کہتے ہیں کہ "چھوڑیئے ان

کتابوں اور اقوال کو صرف کتاب و سنت کی بات سمجھئے۔ یہاں اسی مغالطے کا ازالہ ضروری ہے کہ ان صلحاء امت کی تعبیرات و تشریحات بھی تو کتاب و سنت ہی سے ماخوذ و مستفاد ہیں اور کتاب و سنت ہی کے احکام کی تفصیلات ہیں۔ انہوں نے کتاب سنت کے مقابلے میں کوئی نئی راہ نہیں دکھائی بلکہ وہ خالصتاً اسی ہدایت کے پیرو کار رہے ہیں اور اسی کی اتباع سے اس کمال تک پہنچنے کے قابل ہوئے ہیں۔ قابل غور امر ہے کہ ان صلحاء عاملین کی تعبیرات کو چھوڑ کر جب ہم کتاب و سنت کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم خود قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط نہیں کر رہے ہوتے؟ کیا ہم خود احکام قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح نہیں کرتے؟ کیا ہماری بحث نصوص قرآنی کی اشارت، دلالت اور اقتضا سے نہیں ہوتی۔ کیا ہم عصری مسائل کا حل قرآن و سنت سے تلاش کر کے باقاعدہ آراء و خیالات کو ترتیب نہیں دیتے؟ کیا کتاب و سنت کی روشنی میں جو کچھ ہم درسوں تقریروں، کتابوں اور تفسیروں کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عین نصوص قرآن ہیں یا ان کی تعبیرات و تشریحات؟ سوال یہ ہے کہ اگر ہم کتاب و سنت سے روشنی حاصل کر کے ہزاروں، لاکھوں مسائل پر خیال آرائی کریں تو کیا یہ تحقیقی کام قرآن و حدیث کی راہ سے متصادم ہوگا یا اسی ہدایت کی پیروی اور خدمت متصور ہوگا؟ اگر قرآن و سنت سے ماخوذ ہمارا فکر و تحقیق قابل قبول ہے تو ان نفوس قدسیہ کے افکار و خیالات، جو سراسر قرآن و حدیث کی تعلیمات کے علمی و عملی پیکر تھے، کیونکر ناقابل قبول قرار پاگئے۔ اگر ان کی تحقیقات و تشریحات کو کتاب و سنت کا اصل مدعا و مفہوم سمجھنے کے لئے رہنما تسلیم کر لیا جائے تو آخر اس میں کیا قباحت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقائد و اعمال کے باب میں ان کا قول و عمل اس لئے بھی وقیع اور لائق التفات ہے کہ وہ ہماری نسبت عہد رسالت مآب ﷺ کے زیادہ قریب تھے اور ارشاد نبوی:۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم (ترمذی، ۲: ۵۴)

سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے زمانے کے لوگوں سے ملے، پھر ان کا جو ان لوگوں سے ملے۔

کے مطابق سب سے بہتر تھے اگر آنحضرت ﷺ کے بعد امت محمدی

ﷺ کے برگزیدہ اشخاص کے ذریعے کتاب سنت کی ہدایت میسر نہ آسکتی تو آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ:۔

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدین

(ابو داؤد' ۲:۲۷۹)

تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے۔

یہ امر انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ جدید عصری مسائل مثلاً سیاسی' اقتصادی' قانونی' تعلیمی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق جس قدر نئی اجتہادی تعبیرات قرآن و سنت کی روشنی میں ہوتی رہیں گی۔ اہل اسلام کے لئے قابل قبول اور قابل عمل ہوں گی۔ کیونکہ زندگی ارتقاء پذیر ہے اور جس طرح ان مسائل حیات میں تحرک ہے۔ اسی طرح ان کے حل بھی بتقاضائے حالات ارتقاء پذیر رہتے ہیں۔ لیکن یہ اجتہاد نو عقائد و عبادات کے باب میں ناجائز ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ارتقاء اسلام سے انحراف و ارتداد کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لہٰذا عقائد و عبادات کے سلسلے میں سلف صالحین کی قرآنی تعبیرات و تشریحات کو ہی سند تسلیم کیا جائے گا۔ ایک اور مقام پر قرآن اور ہدایت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس سے ہدایت حاصل کرنے کے طریقہ کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

قَدْ جَآءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ

(المائدہ' ۵:۱۵-۱۶)

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) اور ایک روشن کتاب (یعنی قرآن) آگیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیرو ہیں سلامتی کی راہوں کی ہدایت دیتا ہے۔

گویا قرآن کا یہ برملا اعلان ہے کہ رضائے الٰہی کی پیروی کرنے والے بہرصورت وعدۂ ایزدی کے مطابق ہدایت سے سرفراز کئے جاتے ہیں۔ چونکہ مقام راضیہ و مرضیہ پر فائز مقدس نفوس بارگہ الوہیت سے بہرصورت ہدایت کی نعمت پاتے ہیں'

اس لئے ان کے راستے کی پیروی بھی ہدایت بن جاتی ہے اور انہی سے فکری و عملی وابستگی قرآنی ہدایت کے حصول کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔ مزید برآں اس امر کے یقین اور وثوق کی بنیاد ایک اور حکم قرآنی بھی ہے جہاں شیطان کے سجدہ آدم سے انکار پر جنت سے نکل جانے کے فیصلے کا بیان ہے۔ اس موقع پر قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○
(الزمر ۳۹: ۸۲)

ابلیس نے کہا باری تعالیٰ تیری عزت کی قسم میں سب لوگوں کو گمراہ کروں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جو برگزیدہ اور چنے ہوئے ہیں۔

یہاں متذکرہ بالا حقیقت کی صراحت کر دی گئی ہے کہ خدا کے مقبول و برگزیدہ بندے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و احسان سے ہمیشہ گمراہی سے [illegible] مامون رہتے ہیں اور بنی نوع انسان کو راہ ہدایت سے بھٹکانے کے تمام حیلے اور بہانے صالحین و مخلصین پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ چونکہ انہیں رب العالمین کی طرف سے خصوصی امان اور حفاظت میں رکھا جاتا ہے اس لئے ان کی فکری، علمی، اعتقادی اور عملی رہنمائی میں قرآن سے ہدایت اخذ کرنا ہی طلب ہدایت کا صحیح طریقہ ہے۔

لفظ قرآن کا تیسرا مادہ اشتقاق ----- قراۃ

ائمہ لغت کا تیسرا قول یہ ہے کہ لفظ قرآن کا مشتق منہ **قراۃ** ہے، جس کا معنی پڑھنا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن **فعلان** کے وزن پر اسم مصدر مہموز قرار پایا۔ چنانچہ اس کا معنی "پڑھا گیا یا پڑھایا گیا" ہوگا۔ لغت کے مشہور امام ابو الحسن علی بن حازم اللحیانی اسی قول کی تائید کرتے ہیں جسے امام جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں رقم فرمایا ہے۔ **قراۃ** کا مادہ بھی دراصل **قراء** ہی ہے، جو اکٹھا کرنے اور جمع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانی المفردات میں **قراء** اور **قراۃ** کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

[illegible] قراءۃ [illegible] پڑھنے کو نہیں کہتے۔

القراۃ ضم الحروف او الکلمات بعضھا الی بعض فی الترتیل (المفردات: ۴۰۲)	حروف اور کلمات میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا کر پڑھنا قراۃ کہلاتا ہے۔

قرآن حکیم اسی مفہوم کو اپنے لفظوں میں اس طرح ادا کرتا ہے۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ○ (القیامہ ۷۵: ۱۷-۱۸)	بیشک اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس پڑھے ہوئے کی پیروی کیجئے۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے جس سے اس تصور کی تائید ہوتی ہے:۔

ان القران و القراۃ واحد کالخسران و الخسارۃ	لفظ قرآن اور قراۃ اصل میں ایک ہی چیز ہیں جیسے خسران اور خسارہ۔

علامہ زمخشریؒ نے تفسیر کشاف میں یہ بیان کیا ہے کہ لفظ قرآن لغت میں مصدر ہے اور قراۃ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً **قرات الکتاب قرانا** (میں نے کتاب کو خوب اچھی طرح پڑھا)

یہاں ایک اور پہلو انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ لفظ قرآن کے وزن پر آنے والے تمام مصادر میں ہمیشہ مبالغہ اور معنی کی کثرت پائی جاتی ہے۔ مثلاً رحم سے **رحمان** ہے جس کا معنی صرف رحم کرنے والا نہیں بلکہ "بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے" اس میں معنی رحمت کی کثرت اور مبالغہ موجود ہے۔ اسی طرح **غضب** سے **غضبان** اور **عطش** سے **عطشان** ہے جن کے معنی علی الترتیب بہت زیادہ غضبناک اور شدید پیاسا کے آتے ہیں۔ چنانچہ **قراۃ** سے **قرآن** کا فعلان کے وزن پر وارد ہونا **قرات** کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

بنابریں قرآن سے مراد "وہ کتاب ہے جسے بہت زیادہ پڑھا جائے"۔ جب ہم لفظ قرآن کی معنوی حقانیت کو تاریخی شہادت کے پیمانے پر پرکھتے ہیں تو اسکی صداقت روز روشن کی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی سلیم الطبع شخص اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ تاریخ عالم کے آغاز سے آج تک کوئی الہامی یا غیر الہامی کتاب اس قدر کثرت سے نہیں پڑھی گئی جتنا کہ قرآن مجید۔

قرآن مجید حفظ و ناظرہ، تجوید و قرات، تلاوت و ترجمہ اور تفسیر و تعبیر کے لحاظ سے اس قدر کثرت سے پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے کہ اس سے بڑھ کر اس کی حقانیت پر کسی اور خارجی دلیل کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ یعنی اس کتاب کا نام رکھنے میں جو منشاء الٰہی کار فرما تھا اس کی واقعیت کا نظارہ آج دنیا کا ہر شخص اپنی آنکھوں سے خود کر سکتا ہے۔

معنوی کثرت اور مبالغہ و تکرار کا جو رنگ ہمیں قرآن کے نام میں دکھائی دیتا ہے، وہی رنگ باری تعالیٰ نے صاحب قرآن ﷺ کے نام کو عطا کیا ہے۔

قرآن کی طرح لفظ محمد ﷺ میں بھی معنوی کثرت اور مبالغہ و تکرار پایا جاتا ہے۔ ائمہ لغت و ادب نے لفظ محمد ﷺ کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے:۔

محمد الذی کثرت خصاله المحمودة
(المفردات، محیط المحیط)

محمد ﷺ اس ذات کو کہتے ہیں جس کے اوصاف حمیدہ بے شمار ہوں۔

اسی طرح کہا گیا ہے:۔

و منه محمد کانه حمد مرة بعد مرة قلت الی ما لا نهایه لها
(الطبری، ۲۰:۷ ۱۴)

اور حمد سے ہی لفظ محمد ﷺ نکلا ہے۔ کیونکہ آپ کی بار بار اتنی کثرت سے تعریف کی گئی ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔

امام بغویؒ لکھتے ہیں:۔

محمد هو المستغرق لجمیع المحامد

محمد ﷺ وہ ہستی ہے جو تمام محاسن و

کمالات اور محامد و تعریفات سے معمور

ہے۔

سیدنا حسان بن ثابتؓ نے لفظ محمد ﷺ کی کیا خوب شرح کی ہے:۔

الم تر ان اللہ ارسل عبدہ

ببرھانہ واللہ اعلی و امجد

و شقہ من اسمہ لیجلہ

فذوالعرش محمود و ھذا محمد

(کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالی نے اپنے برگزیدہ بندے کو اپنی کامل ترین دلیل کے ساتھ مبعوث فرمایا حالانکہ وہ خود سب سے برتر و برگزیدہ ہے۔ اور اس نے اپنے بندے کا نام اپنے مقدس نام میں سے نکالا تاکہ وہ بھی پیکر تعریف ہو سکے۔ پس عرش والا خود محمود ہے اور یہ محمد (ﷺ) ہے۔

لفظ قرآن اور لفظ محمد ﷺ کا معنوی جائزہ اس امر کی واضح نشاندہی کر رہا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن دونوں کا تذکرہ ابدالاباد تک کائنات میں جاری و ساری رہے گا۔ یہ دونوں نام اور ذکر باہم لازم و ملزوم ہیں۔

ان میں لفظی اور معنوی مماثلت جہاں اپنی جگہ ایک زندہ اور دائمی معجزے کا درجہ رکھتی ہے وہاں خود اپنی صداقت و حقانیت پر معروضی شہادت بھی پیش کر رہی ہے کیونکہ کائنات ہست و بود میں نہ قرآن سے بڑھ کر کسی کتاب کا پڑھا جانا ثابت ہے اور نہ حضرت محمد ﷺ سے بڑھ کر کسی انسان کا چرچا اور تذکرہ ثابت ہے۔

قرآن کا قرات سے یہ تعلق اس پہلو سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ باری تعالی نے سب سے پہلی قرآنی وحی حکم قرات کی صورت میں نازل فرمائی۔ یہاں ایک اور امر نہایت غور طلب ہے کہ قرات کا مادہ بھی حقیقت میں قراء ہے۔ علامہ زرکشیؒ اس ضمن میں بعض متاخرین کا یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

اما مادتہ "قرا" اظھر وبین اس کا مادہ (قراء) ہے جس کا معنی ظاہر

والقاری یظهر القرآن و یخرجه
(البرہان ۱:۲۷۷)

کرتا اور باہر کرتا ہے۔ قاری کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ قرآنی آیات کو منہ سے نکالتا اور ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح وقت کو بھی **قرء** کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت (REALITY) ہے جو ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کا ظاہر ہونا ایک امر لابدی ہے جسے مخفی نہیں رکھا جاسکتا۔ گویا وقت اپنے وجود پر خود دلیل ہوتا ہے اسے اپنے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے قرآن کا یہ معنی ہوا کہ وہ کتاب جو اپنی صحت اور حقانیت پر خود دلیل ہو۔ چنانچہ قرآن اپنی ذات میں اس قدر واضح، غیر مبہم، ظاہر، روشن اور بین ہے کہ اسے اپنے دعوے کی صحت و حقانیت پر کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں یہ خود اپنے دعوے پر دلیل قاطع ہے اسی لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ
(یوسف ۱۲:۱)

الف، لام، را۔ یہ روشن اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔

سورہ نساء میں اس تصور کو یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا
(النساء ۴:۱۷۴)

اور ہم نے آپ کی طرف واضح نور بھیجا۔

نور خود روشنی کو کہتے ہیں لیکن اسے پھر "مبین" یعنی واضح اور روشن قرار دینے کا مقصد اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ قرآن ایسا نور ہے جسے اپنے ثبوت پر کسی مغایر دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ یہ از خود دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔ یہی مفہوم لفظ "القرآن" کے چوتھے ماخذ سے بھی مستفاد ہے۔

لفظ قرآن کا چوتھا ماخذ ------- القرائن

ابو زکریا یحیٰی بن زیاد الفراء الکوفی، جو معروف ائمہ نحو میں سے ہیں، کے مطابق لفظ قرآن غیر مہموز ہے اور **القرائن** سے مشتق ہے۔ علامہ قرطبیؒ اسی قول کی

تائید کرتے ہیں۔ علامہ واحدی بیان کرتے ہیں کہ ابن کثیر قرآن کا لفظ بغیر ہمزہ کے پڑھتے تھے۔ اسی طرح امام بیہقی کا ایک قول امام شافعی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بھی القرآن کو غیر مہموز پڑھتے تھے۔

القرائن قرینہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی علامت، نشان اور دلیل کے ہیں۔ چنانچہ اس مقدس کتاب کو قرآن اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ہر آیت دوسری آیت کے مدعا و مفہوم کی صحت کا قرینہ ہے۔ گویا قرآن اپنے ہر دعوی کی صداقت و حقانیت کی دلیل بھی خود ہی فراہم کرتا ہے۔ اسے اپنے بیان کی تصدیق کے لئے بنیادی طور پر خارجی قرائن کی احتیاج نہیں ہوتی۔ یہ اعجاز صرف قرآن مجید کا ہے کہ یہ خود ہی اپنے دعوی کی دلیل ہے۔ ورنہ دیگر کتب و صحائف سماوی کی صداقت کا اظہار انبیاء علیہم السلام کے حسی معجزات کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ نبی آخر الزماں ﷺ اور ان پر نازل ہونے والی ابدی کتاب دونوں کا یہ منفرد اعجاز ہے جو کسی اور کتاب اور صاحب کتاب کو حاصل نہیں ہو سکا۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام دعوائے نبوت کرتے تو ان کے دعوی کی دلیل ان کے حسی معجزات ہوتے جو انہیں صحت نبوت کے قرینہ کے طور پر عطا کیے جاتے تھے۔ اسی طرح ان پر جو وحی کی جاتی اس کا اتفاق بھی ارہاصات و معجزات کے ذریعے منصہ شہود پر آتا۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کو منجملہ دیگر خصائص و امتیازات کے یہ اعجاز بھی عطا کیا گیا کہ آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات خود ہی اپنے دعوائے نبوت کی دلیل اتم قرار پائی اور آپ کی کتاب کا ایک ایک لفظ بھی خود اپنے دعوی کی دلیل ٹھہرایا گیا۔

چنانچہ کتاب اور صاحب کتاب ﷺ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے اکمل و اتم معجزے بنا دیئے گئے کہ انہیں اپنے مدعا کی صداقت و حقانیت کے لئے اصلاً کسی اور معجزے کی حاجت ہی نہ رہی۔ اس حقیقت کو قرآن ان الفاظ میں بیان کر رہا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا

(النساء، ۴:۱۷۴)

اے بنی آدم! بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے سب سے زیادہ مضبوط اور اٹل دلیل آگئی اور ہم

نے تمہاری طرف روشن نور نازل فرمایا۔

برہان سے مراد آں حضرت ﷺ کی ذات گرامی ہے اور نور مبین سے مراد قرآن حکیم۔ امام راغب اصفہانی البرہان کا معنی اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

البرھان اوکد الادلۃ وھو الذی یقتضی الصدق ابدا (المفردات:۴۵)

برہان سب سے زیادہ مضبوط دلیل کو کہتے ہیں جو ہمیشہ سچائی پر ہی دلالت کرتی ہے۔

برہان ایسی حتمی اور قطعی دلیل (Final and Conclusive evidence) ہوتی ہے کہ اس کے آجانے کے بعد کسی قسم کے عذر وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ البرہان کا معنی درج ذیل الفاظ میں بھی کیا گیا ہے:۔

الدلیل القاطع للعذر و الحجۃ المزیلۃ للشبھۃ

(البرھان سے مراد) ہر عذر کو ختم کرنے والی دلیل اور تمام شبہات زائل کرنے والی حجت ہے۔

امام خازنؒ اپنی **"تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل"** میں فرماتے ہیں۔

البرھان دلیل علی اقامۃ الحق و ابطال الباطل و النبی کان کذالک لانہ تعالیٰ جعلہ حجۃ قاطعۃ قطع بہ عذر جمیع الخلائق (الخازن، ۱:۴۵٦)

برہان احقاق حق اور ابطال باطل پر دلیل قطعی کا نام ہے اور نبی اکرم ﷺ اسی شان کے مالک تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی حجت قاطعہ بنایا تھا جس سے تمام مخلوقات کے عذر ختم کردیے گئے۔

اسی لئے جب رسول محتشم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید و رسالت کا اعلان فرمایا تو دنیائے کفر کے سامنے دعوی توحید اور اعلان رسالت کی صداقت کے اثبات میں آپ نے جو سب سے پہلی اور آخری دلیل پیش کی وہ خود آپ کی ذات گرامی تھی آپ ﷺ نے فرمایا:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس، ۱۰:۱٦)

میں نے تمہارے درمیان ایک عمر گزاری ہے (یعنی زندگی کے چالیس

برس) پس تم غور کیوں نہیں کرتے۔

چنانچہ حضور علیہ السلام نے اپنی نبوت و رسالت کا دعوی سب سے پہلے اپنی سیرت و کردار کی دلیل کے ساتھ عالم انسانیت کے سامنے پیش کیا۔ روز اول سے آج تک نہ وہ بے مثال دلیل رد ہو سکی اور نہ اس دعوی کا ابطال ہو سکا۔

یہی انفرادیت اس پیغمبر برحق ﷺ کی کتاب کو بھی حاصل ہوئی کہ یہ خود اپنے دعوی کی ایسی دلیل تھی جسے تاریخ عالم میں ہزاروں سازشوں اور تنقیدی کاوشوں کے باوجود رد نہیں کیا جا سکا۔ گویا کتاب اور صاحب کتاب دونوں اتحاد دعوی و دلیل کے ایسے شاندار مظہر ہیں کہ ان کی نظیر عالم امکان میں ناپید ہے۔

قرآنی دعویٰ کیا ہے؟

قرآن اپنی نسبت تین پہلوؤں پر مشتمل دعویٰ کرتا ہے:۔

ایک یہ کہ یہ کتاب کسی فرد کی تصنیف نہیں بلکہ خود خلاق عالم کی نازل کردہ ہے۔ اس کے الفاظ اور معانی سب کچھ الہامی اور منزل من اللہ ہیں۔

دوسرے یہ کتاب اور اس کے جملہ مشمولات حق ہیں اور جو کچھ اس سے متصادم ہو وہ باطل ہے۔

تیسرے یہ کہ اس کتاب کی اطاعت دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضامن ہے اور اس کے آفاقی اصولوں سے انحراف تباہی و ہلاکت کا باعث ہے۔

۱۔ اپنے دعوے کے پہلے حصے کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:۔

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (الشعراء، ۲۶: ۱۹۲)

اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

سورۃ السجدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (السجدہ، ۳۲: ۲)

یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے:۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (الشوریٰ '۴۲:۷)

اور (اے محمد) اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی زبان میں قرآن کی وحی کی ہے۔

سورہ یوسف میں مذکور ہے:۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○ (یوسف '۱۲:۲)

بیشک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

سورۃ الشعراء میں یہی امر مزید صراحت کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے:۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ○ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ○ (الشعراء '۲۶: ۱۹۳۔ ۱۹۵)

اس قرآن کو روح الامین (جبرئیل) لے کر اترے آپ کے دل پر تاکہ آپ ڈر سنانے والوں میں ہوں۔ یہ قرآن روشن عربی زبان میں اتارا گیا۔

اگر نزول قرآن صرف معانی کی صورت میں ہوتا تو وحی کو "عربیت" سے موصوف نہ کیا جاتا۔ وحی قرآنی کو عربی زبان میں نازل کیے جانے کا بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کلام نفسی اور کلام لفظی دونوں کا نام ہے کیونکہ عربیت کلام کے معنی و مفہوم کی نہیں بلکہ الفاظ کی صفت ہے۔

اس دعویٰ میں شرف و امتیاز کا پہلو یہ ہے کہ سابقہ الہامی کتب اور آسمانی صحائف اکثر معانی و مطالب کی صورت میں نازل کیے گئے ان کے الفاظ منزل من اللہ نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے الفاظ محفوظ نہ رہ سکے اور وہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ حذف و اضافہ اور تحریف و ترمیم کا شکار ہو گئے۔ لیکن قرآن اپنی صورت و معنویت دونوں کے اعتبار سے الہامی تھا' کسی مخلوق کا فرمودہ یا مصنفہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ آج تک محفوظ رہا اور ابدالاباد تک محفوظ رہے گا۔

۲۔ قرآنی دعویٰ کا دوسرا حصہ اس طرح مذکور ہے:۔

اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (محمد ۴۷:۲)

جو کچھ حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا وہ اس پر ایمان لائے یہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔

اس بیان میں حصر ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ حق صرف یہی ہے اور جو کچھ اس سے مختلف یا متضاد ہو وہ باطل ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (الانعام ۶:۱۱۵)

بیشک یہ قرآن تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔

یہاں یہ پہلو بڑی صراحت کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن کی پیروی حق ہے اور اس کے ماسوی کی باطل۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ انبیاء و صلحاء کی پیروی قرآن ہی کی پیروی ہے اسے ماسوی کے زمرے میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وضاحت ہدایت قرآنی کے موضوع کے آخری حصے میں آچکی ہے۔ یہاں باطل سے مراد محض اس شئے کی پیروی ہے جس سے قرآن کا انکار و انحراف لازم آئے۔

۳۔ قرآنی دعوے کا تیسرا حصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الاسراء ۱۷:۹)

بیشک یہ قرآن کامیابی و کامرانی کی مضبوط منزل تک پہنچاتا ہے اور اہل ایمان کو خوش خبری دیتا ہے۔

گویا قرآن نے اپنی اطاعت کے ذریعے دنیا و آخرت کی تمام کامیابیوں کو پا لینے کی ضمانت بھی عطا کی ہے۔

یہ تھا قرآنی دعوی جو اس نے اپنے منزل من اللہ حق و صداقت پر مبنی اور فوز و فلاح کا ضامن ہونے کی نسبت بار بار کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قرآنی دعوی کی صحت و حقانیت کی دلیل کیا ہے؟

قرآنی دعویٰ کی دلیل

ہر چند کہ قرآنی دعاوی کی صداقت و حقانیت پر دلالت کرنے والی لاکھوں

شہادتیں عالم آب و گل میں معرضِ ظہور میں آتی رہی ہیں اور تاریخِ اسلام کے اوراق ان شواہد و حقائق سے مزین ہیں لیکن جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ قرآن خود اپنے دعوی کی صحت پر قطعی دلیل ہے۔ اس لیے ہم خارجی شہادت سے صرف نظر کرتے ہوئے خود قرآن کے داخلی قرائن پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تاکہ اسی کے دامن سے اس کے دعوی کی تصدیق میسر آئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○
(العنکبوت ۲۹: ۵۱)

کیا ان (قرآنی دعاوی و احکام کی صحت پر دلیل طلب کرنے والوں) کے لیے یہی کافی نہیں کہ ہم نے جو کتاب آپ پر نازل کی ہے اور جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے بیشک اسی میں ایمان والوں کے لیے رحمت اور تنبیہ و عبرت موجود ہے۔

اگر اس آیت کے بیان پر غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن خود کو نقادانِ عالم اور معترضین اسلام کے سامنے بطور چیلنج پیش کر رہا ہے اور پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے کہ پیغامِ محمدی ﷺ سے انحراف کرنے والو! اگر وحی الٰہی کی صداقت و حقانیت پر تمہیں کوئی حتمی دلیل اور شہادت مطلوب ہو تو آؤ یہ قرآن خود ہی دلیل ہے۔ مختلف زاویۂ نگاہ سے اس صحیفۂ ہدایت کا جائزہ لو اور دیکھو! کیا اس دلیل کا کوئی پہلو ایسا بھی ہے جس پر انگشت اعتراض بلند کی جاسکے؟ کیا اس کی عظمت و کمال اور حسن و جمال کا کوئی گوشہ عیب دار بھی ہے؟ اگر یہ دلیل ہر نقص سے منزہ و مبرا ہے اور اس کی حتمیت و قطعیت ہر لحاظ سے غیر مشکوک ہے تو پھر اس کے ہر دعوی کی صحت اور صداقت پر ایمان لے آؤ۔

قرآن چونکہ قیامت تک کے لئے ہر دور کے لئے صحیفہ ہدایت بنایا گیا ہے اس لئے اسکی دلالت بھی زمانی اور مکانی حدود سے بالاتر رکھی گئی ہے۔ قرآن نے اپنی حقانیت پر ایسے دلائل قائم کیے ہیں جو ہر طبقہ کے انسانوں کے حسب حال ہیں۔ مختلف

انسانوں کا ذہنی فرق و امتیاز ان کے عقل و فہم کا قدرتی تفاوت اور اس کے مقتضیات ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ امر بھی مسلمات میں سے ہے کہ انسانی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہوئی ہے کہ جب تک وہ اپنی سمجھ اور ذہنی استعداد کے مطابق دلیل نہ پائے۔ دعویٰ تسلیم نہیں کرتی' بنابریں قرآن کریم میں ان سب دلائل کو جمع کر دیا گیا ہے جنکی کسی بھی انسان کو قیامت تک کبھی ضرورت ہو سکتی تھی۔ پھر لطف یہ ہے کہ مختلف دلائل کا انکشاف تمام خواص کے علاوہ ہر دور کے عامتہ الناس پر اپنے اپنے وقت پر حسب ضرورت ہوتا رہا ہے۔

قرآنی صداقت کے داخلی قرائن

قرآن نے اپنے دعویٰ پر مختلف انواع واقسام کے دلائل قائم کیے ہیں جو اس کی صداقت و حقانیت کے قرائن ہیں۔ انہیں فنی اصطلاح میں "وجوہ اعجاز القرآن" بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:۔

۱۔ عدم مثلیت ۲۔ حفاظت اور کاملیت و تمامیت ۳۔ عدم اختلاف و تناقض
۴۔ ندرت اسلوب و نظم کلام ۵۔ فصاحت و بلاغت ۶۔ صوتی ترنم و تغنم
۷۔ احوال غیب کا بیان ۸۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت ۹۔ امیت صاحب قرآن ﷺ

اس موضوع پر جاحظ' جرجانی' واسطی' خطابی' رمانی' رازی' ابن سراقہ' باقلانی' اور ابن العربی وغیرہم نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ امام سیوطیؒ نے الاتقان' ابن حزم نے **الفصل فی الملل و النحل**' زرکشی نے البرہان' شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے الفوز الکبیر اور زرقانی نے مناہل العرفان' میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ دور جدید کے مصنفین میں سے سید رضا' سید قطب اور مصطفےٰ صادق الرافعی وغیرہم نے بھی اس موضوع کے بعض گوشوں پر فنی گفتگو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام ائمہ و علماء کی توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو نمایاں کرتی رہی ہیں۔ ان وجوہ کا تعدد باہمی تعارض کا باعث نہیں۔ اسکی مثال اس طرح ہے کہ کوئی حسن جمال کا پیکر اتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے تو ہر شخص

داو نظارہ دیتے ہوئے اپنے مذاق کے مطابق اس حسن کے وجوہ اعجاز پر روشنی ڈالے گا۔ کوئی تناسب اعضاء پر فریفتہ ہو گا، کسی کو رنگ و نزہت پر شیفتگی ہو گی، کوئی قد و قامت کی موزونیت پر نثار ہو گا، کوئی گیسوئے عنبریں کا اسیر ہو گا، کوئی چشم نرگسی میں ڈوب رہا ہو گا اور کوئی جمال آتشیں کی فسوں کاریوں سے متاثر ہو گا۔ الغرض جب حسن کامل اور جمال اتم ہو گا تو اس کی ہر ہر ادا مشتاقان دید کو دعوت نظارہ دے گی اور اہل نظر کو ہر ہر قدم پر "جا ایں جاست" کا سماں نظر آئے گا اور وہ محو حیرت ہو جائیں گے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ قرآن کے اسی اعجاز حسن کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

زفرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

تعبیرات و تشریحات اگرچہ مختلف ہوں انداز ہائے بیاں بھی بیشک بدلے ہوئے ہوں لیکن یہ سب اسی ایک حسن تمام کی جلوہ پاشیاں ہی ہیں:۔

عباراتنا شتیٰ و حسنک واحد
و کل الیٰ ذاک الجمال یشیر

ا۔ عدم مثلیت

قرآن نے اپنے دعویٰ کی صحت و حقانیت کی دلیل اپنی عدم مثلیت کو قرار دیا ہے اور عالم انس و جان کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس کلام کے منزل من اللہ اور مبنی برحق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کا مثل لانے سے قاصر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا
(بنی اسرائیل، ۸۸:۱۷)

اے محبوب تو فرما دے کہ اگر تمام انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مدد گار ہی بن جائیں۔

دوسرے مقام پر مخالفین کو فرمایا گیا کہ پورے قرآن کا مثل لانا تو درکنار قرآن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ پر افتراء پردازی کرنے والے اپنے قول کی تائید میں صرف دس سورتوں کی ہی مثل لے آئیں:۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ (ھود ۱۱: ۱۳)	کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے خود ہی قرآن گھڑ لیا ہے تو کہہ دے کہ اچھا تم اس طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں ہی لے آؤ۔

لیکن اس پر بھی معترضین بے بس رہے تو باری تعالیٰ نے ایک اور چیلنج کیا:۔

إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرہ ۲: ۲۳)	اگر تمہیں کوئی شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل کیا تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام حمائتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

اس کے بعد ابدالاباد تک کے لیے اس امر میں پورے عالم کفر کی ناکامی کا بیان کیا گیا ہے۔ جس کی شہادت چودہ سو سال کی تاریخ دے رہی ہے:۔

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (البقرہ ۲: ۲۴)	پھر اگر تم قرآن کی ایک سورت کی مثل بھی نہ لا سکو اور تم ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو تیار رکھی ہے کافروں کے لیے۔

اس قرآنی دلیل کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ عالم یہودیت اور عالم عیسائیت اسلام کے خلاف کس حد تک برسرپیکار رہے ہیں۔ تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے اور آج بھی اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کتنی کوششیں مغربی واشتراکی اساطین کے ذریعے دنیا میں ہو رہی ہیں جو اہل بصیرت سے

مخفی نہیں لیکن ان بھرپور مخالفانہ کاوشوں کے باوجود آج تک قرآن کی ایک سورت یا آیت کی مثل نہیں بنائی جا سکی۔ اگر اس کے الہامی ہونے کا دعوی غلط ہوتا تو اس کے مماثل کئی نسخے معرض وجود میں آچکے ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عالم عیسائیت میں انجیل کے ۱۳۳ نسخے رواج پا چکے تھے۔ جن میں سے بالآخر ۱۲۹ کو رد کر کے بقیہ چار کو سند صحت عطا کر دی گئی۔

آج بھی انجیل یوحنا، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل متی کے نام سے چار مختلف نسخے موجود ہیں اور پوری دنیائے عیسائیت ان میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اسلام کے خلاف اندرونی اور بیرونی سطح پر لاکھوں سازشیں ہوئیں۔ لیکن قرآن مجید کا عدم مثلیت کا وصف اسی طرح برقرار رہا اور آج بھی تقریباً ایک ارب افراد پر مشتمل ملت اسلامیہ صرف ایک ہی متن کو قرآن مانتی ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ صفحہ ہستی پر آج تک قرآن کا کوئی متبادل نسخہ نہیں کیا جا سکا۔ بعض جھوٹے مدعیان نبوت نے جزوی طور پر ایسی جسارت کرنا چاہی لیکن ہمیشہ خاسر و خائب ہوئے اسی طرح اگر کسی اور نے بھی قرآن کی عظمت و اعجاز کو نہ سمجھتے ہوئے ایسا اقدام کیا تو وہ بھی ناکام و نامراد ہی رہا۔

ابن جوزیؒ "الوفا فی فضائل المصطفی" میں امام ابن عقیلؒ کے حوالے سے ابو محمد نحوی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اعجاز القرآن پر گفتگو کر رہے تھے وہاں فاضل شیخ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ قرآن میں ایسی کون سی ندرت و کمال ہے جس سے فضلاء و بلغاء عاجز آجائیں۔ پھر وہ کاغذ قلم لے کر بالا خانے پر چڑھ گیا اور وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد قرآن مجید کی مثل کچھ لکھ کر لاؤں گا۔ جب تین دن گزر گئے اور نیچے نہ اترا تو ایک شخص بالا خانے پر چڑھا تو اسے اس حال میں پایا کہ اس کا ہاتھ قلم پر سوکھ چکا تھا۔ ایسے واقعات "فان لم تفعلوا" (پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے) کی زندہ شہادتیں ہیں۔

۲۔ حفاظت اور کاملیت و تمامیت

قرآنی حقانیت کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ

بھی خود ہی فرمایا ہے:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ (الحجر‘ ۱۵:۹)
بیشک یہ قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

چنانچہ وعدہ الٰہی کے مطابق قرآن آج تک ہر قسم کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہا ہے۔ اس لیے یہ کامل بھی ہے تمام بھی۔ عہد رسالت ﷺ میں جب قرآنی آیات متعدد اشیاء پر معرض تحریر میں لائی جاتی تھیں اور مکمل طور پر محررہ اور مرتب شدہ کوئی جلد موجود نہ تھی۔ اس دور میں بھی پورا قرآن تحریری طور پر موجود و محفوظ تھا اور خود نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کئی صحابہ بھی قرآن کے حافظ تھے۔ لیکن باقاعدہ طور پر عہد صدیقی میں مصحف کے نام سے ایک جامع نسخہ قرآن مرتب کیا گیا۔ جسے سورتوں کی طوالت و قصارت کے اعتبار سے سبع طوال‘ مئین‘ مثانی اور مفصل میں تقسیم کر دیا گیا‘ لیکن سور و آیات کی ترتیب وہی رہی جو خود رسول اکرم ﷺ نے بذریعہ وحی مقرر فرمادی تھی۔

چنانچہ عہد عثمانی میں پھر تمام صحابہ و اہل بیت اور حفاظ کرام کے مکمل اتفاق سے سرکاری طور پر ایک نسخہ تیار کیا گیا جو مصحف عثمانی کے نام سے معروف ہوا۔

قرآن کی جمع و تدوین کا یہ کام جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پایۂ انجام تک پہنچا‘ دراصل خود اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کی حفاظت میں ہوا۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے:۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (القیامہ‘ ۷۵:۱۷)
اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اس پہلو کا مطالعہ بیعت رضوان کے حوالے سے نہایت ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تدوین کا آخری کام متعدد صحابہ و خلفاء کے باوجود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کیوں لیا؟ اس کی وضاحت صلح حدیبیہ کے واقعہ سے ہوتی ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ہمراہ بمقام حدیبیہ پڑاؤ کیا اور

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا۔ اس اثناء میں اطلاع ملی کہ کفار و مشرکین مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ اندریں صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام سے جہاد پر آمادگی کی بیعت لی جسے "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔

اس کا ذکر قرآن حکیم میں یوں آتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ
(الفتح، ۴۸: ۱۰)

آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ اور آپ سے بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا۔ جب تمام صحابہ کرامؓ کی بیعت ہو چکی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان عثمان فی حاجۃ اللّٰہ تعالیٰ و حاجۃ رسولہ فضرب باحدی یدیہ علی الاخری فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان رضی اللہ عنہ خیرا من ایدیھم لانفسھم (ترمذی، ۲: ۲۱۱)

(اے اللہ) عثمان تیرے اور تیرے رسول کے کام گیا ہوا ہے۔ پس آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور اپنے ہی ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے ان کی طرف سے بیعت لی۔ پس حضرت عثمانؓ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ دیگر تمام صحابہ کے لیے ان کے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔

ابن ہشامؒ لکھتے ہیں:۔

بایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان رضی اللہ عنہ فضرب باحدی یدیہ علی الاخری

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت لے لی۔

(تفسیر ابن کثیر، ۴: ۱۸۶-۱۸۷)

اب یہ پہلو قابل غور ہے کہ ادھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا جبکہ دوسری طرف "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" کے مطابق حضور علیہ السلام کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا۔ گویا بالواسطہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دست حفاظت قرار دیا۔ لہذا اس ہاتھ سے جمع و تدوین قرآن کے کام کا انجام پانا وعدہ الٰہی "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ" (قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے) کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کے دست قدرت سے ہی انجام پانا ہے۔

یہ اسی حفاظت الٰہیہ کا کرشمہ ہے کہ ۱۴۰۰ سال گزر جانے کے باوجود آج تک قرآن میں ایک آیت یا ایک لفظ اور حرف کی حد تک بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ آج بھی بعض علاقوں میں ہزار بارہ سو سال پرانے کلام مجید کے نسخے موجود و محفوظ ہیں لیکن ان میں اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں زیر زبر تک کا فرق نظر نہیں آتا۔ قرآنی حقانیت کا اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے۔

باری تعالیٰ نے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" (بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں) کے الفاظ کی صورت میں وعدہ حفاظت قرآن کے سوا کسی اور الہامی کتاب یا صحیفے کے حق میں نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ بائیبل (BIBLE) کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ ردو بدل' حذف و اضافہ اور تحریف و ترمیم کی تاریخ ہے۔ دوسری صدی عیسوی سے لیکر سترھویں صدی عیسوی تک عہد نامہ جدید (NEW TESTAMENT) میں کئی حصوں کو پادریوں کے حسب منشاء اور مختلف کونسلز (COUNCILS) کے فیصلوں کے مطابق کبھی داخل کیا جاتا رہا اور کبھی نکالا جاتا رہا۔ برنباس اور کئی کتابیں جن کا مجموعہ ۱۶۷۲ء میں اپوسٹالک فادرز (APOSTOLIC FATHERS) کے نام سے شائع ہوا تھا' ایسی تھیں جنہیں عیسائیت کے اوائل دور میں نہایت مقبولیت حاصل رہی لیکن بعد میں انہیں بائیبل میں سے محض اس لیے خارج کر دیا گیا کہ ان کی

تعلیمات سینٹ پال کی خود ساختہ عیسائیت کے باطل عقائد کے خلاف تھیں۔ اسی طرح اپوکریفا (APOCRYPHA) اس عیسائی لٹریچر کا مجموعہ ہے جسے عیسائی پادریوں نے اپنے مذہبی مفادات کے خلاف تصور کرتے ہوئے چھپا دیا۔ لیکن انکا وجود دنیا سے اب تک ختم نہیں ہو سکا۔

سب سے پہلی مکمل بائبل گوٹن برگ (GUTEN BURG) کے مطبع سے ۱۴۵۵ء میں ولگیٹ (VULGATE) کے نام سے چھپی جس کے خلاف ۱۶ویں صدی کے اوائل میں پھر پروٹسٹینٹ اصلاحی تحریک کے ساتھ اعتراضات و تنقیدات کا دروازہ کھل گیا۔ الغرض ۱۵۴۶ء میں COUNCIL OF TRENT کے ذریعے اسے حتمی شکل دی گئی اور بالآخر رومن چرچ نے اسے بائبل کے مستند نسخے کے طور پر اپنا لیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں پھر ردوبدل کی ضرورت محسوس کی گئی اور POPE SIXTUS V نے ضروری ترمیمات و تصحیحات کے ذریعے یونیورسٹی آف پیرس کے متن کی صورت میں ۱۵۹۰ء میں شائع کیا۔ یہ مختصر تاریخی خاکہ تمثیلاً اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے تناظر میں قرآن کی حفاظت اور کاملیت و تمامیت کا جائزہ لیا جاسکے کہ دوسری الہامی کتابوں کے ارتقائی احوال کیا ہیں اور وہ کس طرح ہمیشہ ناقص و ناتمام رہی ہیں اور ان کے برعکس قرآن کا عالم کیا ہے کہ وہ ابتدائی دور سے لیکر آج تک اپنے متن اور عبارت کے لحاظ سے کامل و مکمل رہا ہے۔ اس میں آج تک نہ کسی لفظ یا آیت کی کمی کی گئی اور نہ کسی شے کا اضافہ۔ یہ جس حالت میں پیغمبر اسلام ﷺ نے امت کو عطا کیا تھا۔ آج تک اسی حالت میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے محفوظ ہے۔

۳۔ عدم اختلاف و تناقض

قرآن اپنے اعجاز پر ایک دلیل یہ بھی پیش کرتا ہے کہ وہ اختلاف و تناقض سے مبرا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا
(النساء ۴: ۸۲)

اگر قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ یقیناً اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مصنفین کی تالیفات سے قطع نظر دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں پر بھی نظر ڈالیے تو آپ کو لاتعداد تضادات ملیں گے جن میں تطبیق بھی ممکن نہ ہو گی۔ مضامین کا اختلاف، ناموں اور نسبوں کا اختلاف، واقعات کا اختلاف، لشکر کی تعداد کا اختلاف، بیانات کا اختلاف، سنین و اوقات کا اختلاف، الغرض اجمال و تفصیل میں ہر جگہ مضحکہ خیز حد تک تضادات اور تناقضات ہیں جن کا جواب آج تک اس مذہب کے پیروکار نہیں دے سکے اور نہ ہی ایسی کتابوں کو موضوع یا محرف ماننے کو تیار ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت کا مشاہدہ بائیبل کے تنقیدی و تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا امیریکانا (ENCYCLO PAEDIA AMERICANA) میں بائیبل (BIBLE) کے مضمون کے تحت اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف نسخہ جات میں کم و بیش تیس ۳۰ ہزار اغلاط موجود ہیں۔ اسی طرح

FRED GLAD STONB BRATTON نے

"HISTORY OF BIBLE" مطبوعہ بوسٹن U.S.A صفحہ ۵ پر

اس حقیقت کو بصراحت تسلیم کر لیا ہے کہ بائیبل کے اندر واقعاتی اغلاط، غیر سائنسی نظریات، خدا اور انسان کی نسبت ناپاک تصورات، تضادات و تناقضات، نامعقول بیانات مبالغہ آمیزیاں اور ناپختہ خیالات کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قرآن اول سے آخر تک ہر قسم کے اختلاف اور تناقض سے پاک ہے بلکہ ہر آیت دوسری کی موید اور ہر مقام دوسرے کا مصدق ہے:۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلت باید ازوی رومتاب

قرآن حکیم میں ایک واقعہ بعض اوقات متعدد جگہ بیان ہوتا ہے۔ ہر مقام پر

انداز بیان اور [illegible] خفیف سا اختلاف بھی نظر نہیں آسکتا۔ اس امر کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہو سکتا ہے کہ قرآن دیگر کتابوں کی طرح تصنیف نہیں ہوا بلکہ ۲۳ سال کے عرصہ میں کبھی دن کو، کبھی رات کو، کبھی سفر میں، کبھی حضر میں، کبھی گھر اور کبھی میدان جنگ میں الغرض ہمیشہ ہنگامی صورت میں اس کی چند آیات جن کی تعداد بالعموم تین سے دس تک ہوتی تھی نازل ہوتیں۔ آپ ذرا غور فرمائیے کہ اس طرح آیات کا تدریجی نزول ۲۳ سال تک جاری رہے۔ اس عرصہ میں حالات کے ہزاروں زیر و بم آئیں اور قرآن ایک جلد کی صورت میں مرتب بھی نہ ہو رہا ہو بلکہ لوگ اپنے طور پر کاغذوں، کپڑوں، پتھروں اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرتے ہوں۔ اس انداز سے اس کا نزول اور جمع و تدوین عمل میں آئے اور پھر بھی یہ ہر قسم کے اختلاف سے یکسر پاک رہے تو اس کے منزل من اللہ اور مبنی بر حق ہونے میں کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ مستزاد یہ کہ اس وقت پریس بھی نہ تھے۔ صرف قلمی نسخوں کے ذریعے قرآن کی اشاعت ہو رہی تھی۔ نہ صرف عرب بلکہ فلسطین، مصر، شام، عراق، یمن اور ہندوستان تک کے عجمی ممالک میں بھی قلمی نسخے تیار ہوئے اور ہر ایک کے سامنے صرف مصحف عثمانی کا معیار تھا اگر حفاظت الہیہ شامل حال نہ ہوتی تو عمداً یا سہواً عبارات قرآنی میں کئی اختلافات پیدا ہو سکتے تھے۔ جس طرح احادیث کے معاملے میں وضع حدیث کا فتنہ وجود میں آیا یہ فتنہ دامن قرآن کو بھی متاثر کر سکتا تھا لیکن یہ اعجاز قرآن تھا کہ آج تک ایسا اختلاف صرف اعراب کی حد تک بھی پیدا نہ ہو سکا۔ حالانکہ اعراب لگانے کا کام بھی عہد رسالت ﷺ کے بہت بعد میں ہوا۔ اس سے پہلے تمام نسخے بغیر اعراب کے پڑھے جاتے تھے اندریں حالات قرآن حکیم کا ہر قسم کے اختلاف و تناقض سے مبرا ہونا اس کے حق اور منزل من اللہ ہونے کی بین دلیل ہے۔

۴۔ ندرت اسلوب و نظم کلام

عہد نزول قرآن تک عربوں میں قصائد، مکتوبات، خطابات اور محاورات کے

صرف چار اسالیب معروف تھے اور وہ کسی پانچویں انداز بیان سے واقف نہ تھے۔ ان معینہ اور معلومہ اسالیب سے مختلف ایک نیا اسلوب بیان پیدا کرلینا ایک معجزہ تھا۔

قرآن کی ندرت اسلوب کا یہ عالم ہے کہ یہ انداز آج تک کسی اور ادب میں پیدا نہیں ہو سکا۔ عام کتابیں ابواب و فصول پر منقسم ہوتی ہیں لیکن قرآن ایسی تبویب و تفصیل سے پاک ہے اور نہ اس کے مختلف مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے اسلوب بیان اور نظم کلام میں ایک تسلسل اور روانی ہے کسی جگہ پر انقطاع نظر نہیں آتا۔ قرآن نے اپنی بعض سورتوں کو حمد و ثنا سے شروع کیا اور بعض کو غرض بیان کی وضاحت سے، بعض کا اختتام جامع کلمات پر کیا اور بعض کا نصیحتوں پر، کبھی وعدہ ذکر کیا کبھی تبشیر کا انداز اپنایا، کبھی تہدید کی کبھی تاکید، کبھی مخلوق کا بیان کیا کبھی خالق کا، کبھی کائنات کی نشانیاں بیان کیں کبھی قصص واقعات، کبھی حلت و حرمت کے احکام دیئے کبھی استثناء و رخصت کے، کبھی احقاق حق کیا کبھی ابطال باطل، کہیں مخاصمہ کا رنگ اپنایا کہیں موعظت کا، کہیں انبیاء و مرسلین کی تعلیمات و خدمات بیان کیں کہیں ان کی عظمتیں اور رفعتیں، کہیں خطاب ہے کہیں غیبت اور کہیں تکلم، انداز کلام بغیر تکلف کے بڑی بے ساختگی سے بدلتا رہتا ہے لیکن حلاوت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ قرآن کے اسلوب بیان اور نظم کلام کے سلسلے میں مزید دو امور قابل توجہ ہیں:۔

الف۔ انتشار مطالب ب۔ تکرار مضامین

قرآنی علوم اور معارف و مطالب عام طور پر پانچ انواع پر مشتمل ہیں۔ علم الاحکام، علم المخاصمہ، علم التذکیر بالاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت۔

(الف) قرآنی اسلوب میں انتشار مطالب کا معنی یہ ہے کہ قرآن اس امر کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورت میں صرف فلاں نوع کا علم مذکور ہوگا اور دوسری سورت میں فلاں نوع کا بلکہ ایک ہی سورت میں متعدد انواع کے مطالب و معارف بیان کرتا چلا جاتا

ہے۔ ایک حکم کے ساتھ متصلاً دوسرا حکم بیان کرنا کسی دوسری کتاب میں ادبی مذاق لطیف پر گراں گزرتا ہے لیکن قرآنی اعجاز کا یہ عالم ہے کہ بدلتے ہوئے مضامین و مطالب کے باوجود بیان اور تفہیم مین روانی اور لطافت برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب روئے سخن بدل گیا ہے۔ بات بغیر بار کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً "سورہ الضحیٰ" کا مطالعہ کیجئے:۔

وَالضُّحٰی ○ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ○ مَاوَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی ○ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌلَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ○ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ○ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ وَ وَجَدَکَ ضَالًّا فَھَدٰی ○ وَ وَجَدَکَ عَائِلًا فَاَغْنٰی ○ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ ○ وَ اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْھَرْ ○ وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ○ (الضحیٰ: ۹۳)

قسم ہے چاشت کی اور رات کی جب وہ پردہ ڈال دے کہ (اے محبوب) تجھے تیرے رب نے نہ چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی وہ ناراض ہے بے شک تمہارے لیے (ہر) پچھلی گھڑی پہلی سے بہتر ہے۔ اور بے شک تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ کیا اس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جگہ دی اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی اور تمہیں حاجت مند پایا پھر غنی کر دیا۔ تو یتیم پر دباؤ نہ ڈال اور سائل کو نہ جھڑک اور اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کر۔

یہاں چاشت اور رات کی قسم کھائی جا رہی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ روٹھنے کا بیان ہے، پھر آپ کو خوشخبریاں سنائی گئی ہیں، پھر آپ کی یتیمی اور محبت میں وارفتگی کا ذکر ہے، پھر حاجت مندی کے دور کا ذکر ہے، اس کے بعد یتیموں اور سائلوں سے بھلائی کا حکم ہے اور پھر تحدیث نعمت کا حکم ہے۔ ایک چھوٹی سی سورت میں احکام، انعامات الٰہیہ اور سابقہ احوال و واقعات سب کچھ درج کر دیا گیا ہے، اسی طرح سورہ

یوسف، سورہ کہف، سورہ بنی اسرائیل، سورہ ہود، سورہ یونس اور دیگر سورتوں کا مطالعہ کیجئے، آپ کو مطالب کے تنوع اور انتشار میں بھی ایک ہم آہنگی اور اتصال نظر آئے گا۔ یہ خوبی دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اس میں مضامین کے تنوع کے باوجود آیات کے درمیان معنوی ربط برقرار رہتا ہے۔ سورہ الکوثر پر نظر ڈالیے:۔

إِنَّا أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ○ (الکوثر: ۱۰۸)	اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے بیشک تمہارا دشمن ہی محروم و نامراد ہے۔

اس مختصر سی سورت کے تین جملے ہیں۔ تینوں جملوں میں الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ مستقل معنی و مطلب بیان کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں احکام مختلف ہیں لیکن ایک دوسرے سے معنوی اعتبار سے پیوست معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے عطاء نعمت کا بیان ہے پھر حکم عبادت، آخر میں مخالفوں کے لیے چیلنج ہے بلکہ پیشین گوئی بھی ہے۔ گویا انتشار مطالب میں بھی معنوی اتحاد اور تسلسل کی کیفیت نظر آتی ہے۔

(ب) تکرار مضامین میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی بیان کا مقصد صرف ایک حقیقت سے دوسرے کو آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اسے سامع کے دل میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے پہلے مقصد کے لیے تو صرف ایک مرتبہ کا بیان کافی رہتا ہے لیکن دوسرے مقصد کے لیے بات کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے ایسے مضامین کے لیے قرآن کے پیش نظر دوسرا مقصد تخاطب تھا۔ چنانچہ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا۔ لیکن ہر دفعہ نئی حکمت و موعظت کے ساتھ۔ جس طرح ذوق لطیف کا حامل شخص ایک اچھا شعر بار بار سنکر نئی لذت اور لطف اٹھاتا ہے اسی طرح قرآن میں تکرار مضامین ہر بار نئی لذت اور لطف کا باعث بنتا ہے، اکثر کسی نثر کی کتاب میں ایسا ہو تو طبیعت پر بوجھ بنتا ہے اور عبارت اپنی رنگینی و دلکشی کھو بیٹھتی ہے لیکن قرآن منظوم

نہیں نثر ہے اس کے باوجود اس کی بے پایاں لذت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ مثلاً سورۃ شعراء میں **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝** (الشعراء: ۲۶) آٹھ بار آیا ہے' سورہ قمر میں **وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۝** (القمر: ۵۴) چار مرتبہ آیا ہے' سورہ مرسلات میں **وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ۝** (المرسلات: ۷۷) دس بار آیا ہے' سورہ رحمٰن میں **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝** (الرحمان: ۵۵) اکتیس مرتبہ آیا ہے' لیکن ہر جگہ ایک نیا لطف اور منفرد کیفیت نصیب ہوتی ہے بلکہ اس تکرار سے دل و دماغ پر اکتاہٹ کے بجائے ہر بار نئے معانی و غوامض اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ علامہ بدر بن جماعہؒ نے اسی موضوع پر "**المقتنص فی فوائد تکرار القصص**" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

۵۔ فصاحت و بلاغت

قرآن کا اسلوب سادگی اور سلاست کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر ہے جس کا معارضہ آج تک بڑے بڑے فصحاء و بلغاء نہیں کر سکے۔ اس میں مقتضائے حال کی رعایت' استعارہ و کنایہ کا استعمال اور صنائع و بدائع کا وجود ناقابل بیان حسن اور ادبی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ علامہ کرمانیؒ اپنی کتاب "العجائب" میں لکھتے ہیں کہ معاندین نے عرب و عجم کے تمام کلام ڈھونڈ مارے مگر کوئی کلام بھی حسن نظم' جودت معانی' فصاحت الفاظ اور ایجاز میں اس کی مثل نہ پایا اور بالآخر اس امر پر متفق ہو گئے کہ انسانی طاقت قرآن کی آیت کی مثل لانے سے قاصر ہے۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا یہ اعجاز ہے کہ دنیائے عرب کے ادبی شاہکار "سبع معلقات" جو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے' نزول قرآن کے بعد اتار لیے گئے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کوئی شے بھی معارضہ نہیں کر سکتی۔

فصاحت قرآنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(الف) مجاز و کنایہ

۱۔ نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ (البقرہ ۲:۲۲۳) — تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں آؤ جیسے چاہو۔

۲۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ ۲:۱۸۷) — عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

۳۔ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (النساء ۴:۴۳) — یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔

۴۔ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا (الاعراف ۷:۱۸۹) — جب وہ (شخص) اس (عورت) کے پاس گیا تو اس نے ہلکا سا بوجھ اٹھا لیا (یعنی وہ امید سے ہو گئی)

۵۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ (المائدہ ۵:۶۴) — بلکہ اسکے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں جس لطافت کے ساتھ مجاز اور کنایہ کے انداز میں ہر بات کہی گئی ہے اس کا اندازہ صاحب ذوق لطیف ہی کر سکتا ہے۔

ان آیات میں بیان کے بے ساختگی اور اظہار کی بے تکلفی بھی ہے اور کمال درجہ حیاء و شرافت کی آئینہ داری بھی۔ اشاروں میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ایسے مضامین اور احکام و مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا ادیب اشارت اور صراحت کے ایسے خوبصورت امتزاج کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(ب) تشبیہ و استعارہ:

۱۔ مَثَلُ نُورِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ (النور ۲۴:۳۵) — اس کے نور کی مثال قندیل کی ہے جس میں چراغ ہو۔

۲۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (الجمعہ ۶۲:۵) — گدھے کی طرح جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہوں۔

یہاں قسم سے نفع فائدہ نہ اٹھانے والوں کا بیان کس قدر خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

٣۔ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ○ وَ الصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ○ (التکویر‘ ٨١: ١٧۔ ١٨)

قسم ہے رات کی جب پیٹھ دے (یعنی تاریکی ہلکی پڑے) اور صبح کی جب دم لے (یعنی آہستہ آہستہ نمودار ہو)

ان دو آیات میں رات کے دھیرے دھیرے جانے اور صبح کے رفتہ رفتہ آنے کا ذکر نہایت دلکش انداز میں ہے۔

چند مزید آیات ملاحظہ ہوں جن کی فصاحت و بلاغت رشک ادب ہے:۔

١۔ وَقِيْلَ يٰٓأَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِىَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ھود‘ ١١: ٤٤)

اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے اور آسمان تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام ہوا اور کشتی کوہ جودی پر ٹھہری اور فرمایا گیا دور ہوں بے انصاف لوگ۔

امام سیوطیؒ "الاتقان" میں ابن ابی الاصبع کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے آج تک اس آیت کی مثل نہیں دیکھی۔ اس میں سترہ لفظ ہیں اور بیس بدائع ہیں:۔

ابلعی اور **اقلعی** میں مناسبت تامہ ہے۔ **ابلعی** اور **اقلعی** میں استعارہ بھی ہے‘ **ارض و سماء** میں صفت طباق ہے‘ **یاسماء** میں مجاز ہے‘ **غیض الماء** میں اشارہ ہے‘ **واستوت** میں صفت ارداف ہے‘ **قضی الامر** میں تمثیل ہے‘ **قضی الامر** میں تعلیل بھی ہے کیونکہ **غیض الماء** اس کی علت ہے‘ اس میں صحت تقسیم بھی ہے‘ اس میں احتراس فی الدعا ہے‘ اس میں حسن نسق ہے‘ اس میں **ائتلاف اللفظ مع المعنی** ہے‘ اس میں ایجاز ہے‘ اس میں تسہیم ہے کیونکہ آیت کا اول اس کے آخر پر دلالت کرتا ہے‘ اس میں تہذیب ہے کیونکہ اس کے مفردات میں حسن ہے‘ ہر لفظ **سہل المخرج** ہے اور بشارت و عقارت سے خالی ہے‘ اس میں حسن بیان ہے‘ اس میں تمکین

ہے اس میں انسجام ہے اور اس میں اعتراض بھی ہے کیونکہ یہاں تین جملے معترضہ لائے گئے ہیں۔

اسی طرح ایجاز کی مثال ملاحظہ ہو:۔

۲۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ (البقرہ ۲: ۱۷۹) — تمہارے لئے انتقام وقصاص میں زندگی مضمر ہے۔

"الاتقان" میں مذکورہ کہ اس آیت میں بھی ۲۰ صنعتیں بیان ہوئی ہیں۔

۳۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ (البقرہ ۲: ۲۵۷) — اللہ ایمان والوں کا دوست ہے انہیں اندھیروں میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس کی فصاحت وبلاغت کے بیان پر امام سیوطی نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں ایک سو بیس بدائع بیان کئے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ جو لوگ وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے اعجاز قرآن کی کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں، فصاحت وبلاغت قرآنی خود اپنی صداقت وحقانیت پر دلیل قاطع ہے۔ جن لوگوں نے سلامتِ ذوق اور استقامتِ طبع کے ساتھ عرب کے اساتذہ شعرو سخن کا کلام پڑھا اور اپنے ذوق ووجدان کو پختہ وشائستہ بنا لیا انہیں ہی فصاحت قرآن کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

احادیث، سیرو مغازی اور تاریخ اسلام کے طلبہ جانتے ہیں کہ عتبہ بن ربیعہ انیس غفازی، ولید بن ضماد، عمرو بن جموح، حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبد اللہ بن رواحہ، لبید، طفیل بن عمر، زید الخلیل، کعب بن زہیر، شماس اور اسود بن سریع وغیرہم عرب کے ایسے معروف اور نامور سردار، سخن گو اور شعراء تھے جو قرآن کی فصاحت وبلاغت کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی نے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (الحجر ۱۵: ۹۴) کے الفاظ سنے اور سربسجود ہو گیا۔

اسی طرح قرآن کی یہ آیت فصاحت وبلاغت کا کیسا عظیم نمونہ ہے:۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ — اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ

فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَآدُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ○ (القصص ۲۸: ۷)

تم اس کو دودھ پلاؤ اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دو اور نہ خوف کرو نہ غم پھر ہم موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔

سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو امر کے صیغے اور دو نہی کے، دو خبریں اور دو بشارتیں بیان فرمائیں ہیں۔ قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت اس کے دعاوی اور اعلانات کی صحت و حقانیت کی ایسی دلیل ہے کہ کوئی بھی سلیم الطبع صاحب فن اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

۶۔ صوتی ترنم و تغنم

قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ یہ معنوی نغمگی اور باطنی موسیقیت شعری اوزان و قوافی سے مبرا ہونے کے باوجود فراوانی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی سحربیانی کافی حد تک اس حسن صوتی پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی سور ۳ اقسام پر منقسم ہیں۔ "طویل" مثلاً سورۃ النساء، "متوسط" مثلاً سورہ الاعراف اور الانعام اور "قصیر" مثلاً سورہ الشعراء اور الدخان میں صوتی ترنم کی یہ کیفیت ہر شخص کے لئے عجیب لطف کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ○ (القلم ۶۸: ۱)

۲۔ وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ○ فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفًا ○ وَالنَّاشِرَاتِ نَشْرًا ○ فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا ○ فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا ○ عُذْرًا أَوْ نُذْرًا ○ (المرسلات ۷۷: ۱-۶)

۳۔ فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ○ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ○ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ○ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ ○ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ○ (المرسلات ۷۷: ۸-۱۲)

۴۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ ○ لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ○ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○ لَا تَسْمَعُ فِيهَا

[illegible]

۵۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَاO وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَاO وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَاO وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَاO وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَاO وَالْأَرْضِ وَمَا طَحٰهَاO وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاO فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاO قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَاO وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاO

(الشمس ۹۱: ۱۔۱۰)

۶۔ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَاO وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَاO وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَالَهَاO (الزلزال ۹۹: ۱۔۳)

۷۔ فَأَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًاO فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًاO (العادیات ۱۰۰: ۴۔۵)

مذکورہ بالا آیات میں سے ہر ایک کا اختتامی لفظ ایک خاص صوتی نغمگی پیدا کر رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور وزن، ان کا آپس میں جوڑ اور ترکیب، پھر ان میں تلفظ کی سلاست اور بہاؤ ایک عجیب موسیقیت اور موزونیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو بار بار پڑھیں، سادگی سے پڑھیں یا مترنم انداز میں زبان میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور ہر لحہ عجیب سی حلاوت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ مستزاد یہ کہ اگر مذاق سلیم اور حس لطیف ہو تو ان آیات کے تلفظ سے ہی کسی حد تک معنی و مفہوم کی ترجمانی ہوتی نظر آتی ہے۔

۱۔ مثلاً سورۃ الناس کو بار بار پڑھیں تو ہر آیت کا آخری حرف "س" کثرت استعمال کے باعث سرگوشی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ یہی سرگوشی اور وسوسہ اندازی اس سورت کا موضوع ہے۔

۲۔ اسی طرح سورہ الملک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ — کچھ بعید نہیں کہ جہنم غصہ سے پھٹ جائے۔

(الملک ۶۷: ۸)

یہاں لفظ تمیز میں "ی" پر شد سے جو آواز پیدا ہو رہی ہے اسی سے غیظ و غضب کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

۳۔ سورہ الفجر کی ان آیات کو پڑھیے اور ان کے تلفظ پر غور کیجیے:۔

إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ○ (الفجر ۸۹: ۲۱)

جب زمین ٹکرا کر پاش پاش کر دی جائے گی۔

اس میں دکت اور دکا دکا کے الفاظ کی تشدیدات سے جو صوتی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اسی سے ہی ٹکرانے اور پاش پاش ہونے کا تاثر ابھرتا ہے۔

۴۔ اسی طرح سورہ الرحمان میں ملاحظہ فرمائیں:۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ○ (الرحمان ۵۵: ۱۹)

اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں ملے ہوئے معلوم ہوں۔

۵۔ اس آیت کے تینوں الفاظ میں صوتی بہاؤ اور روانی کا سماں پایا جاتا ہے اور یہی اس کا موضوع ہے۔

فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ○ (الرحمٰن ۵۵: ۶۶)

ان میں دو چشمے ہیں چھلکتے ہوئے۔

۶۔ اسی طرح:۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ (الرحمٰن ۵۵: ۷۶)

تکیہ لگائے بچھونوں پر۔

کے الفاظ میں سکون کی نشاندہی ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآنی آیات اپنے اندر ایک قدرتی تناسب وتوازن، موزونیت وموسیقیت اور ترنم وتغنم رکھتی ہیں جس سے خاص قسم کی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صفت بھی قرآن ہی کا اعجاز ہے ایسا رنگ آج تک کسی اور کلام میں نہیں دیکھا جا سکا۔

۷۔ احوال غیب کا بیان

قرآن حکیم کی صداقت وحقانیت کا ایک بہت بڑا ثبوت اس میں احوال غیبی کا بیان ہے قرآن مجید نے اپنی اس حیثیت کو خود اپنے لفظوں میں اس طرح واضح کیا ہے:۔

ذَالِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (آل عمران ۳: ۴۴)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔

[illegible] کرتے ہوئے فرمایا:-

تِلْکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْھَآ اِلَیْکَ مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا (ھود ١١:٤٩)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

قرآنی اعجاز کا یہ پہلو خود نبی اکرم ﷺ کے نمایاں معجزات میں سے تھا۔ آنحضرت ﷺ کبھی علوم غیب کے بیان میں بخل نہیں کرتے تھے۔ سائل جس قسم کا بھی سوال لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تسلی بخش جواب پا کر جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے ہمہ جہت علم کے اس گوشے کا ذکر قرآن حکیم یوں کرتا ہے:-

وَمَا ھُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ (التکویر ٨١:٢٤)

اور رسول اکرم ﷺ غیب بیان کرتے میں کوئی بخل نہیں کرتے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:-

"یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیب کی خبر دیتا ہے، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے، اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکام شرعیہ سے، مذہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے اور ان چیزوں کے بتلانے میں آپ ذرا بخل نہیں کرتے"۔

بعد میں وہ پیغمبر علیہ السلام کے علم غیب کے بیان کے پیش نظر لکھتے ہیں:-

"کاہنوں کو ان سے کیا نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو محض غیب کی جزئی اور ناکمل بات وہ بھی جھوٹ ملا کر بیان کرتے ہیں اور اتنی بات میں بھی بخیل ہوتے ہیں"۔

قرآن حکیم میں احوال غیب کا بیان کئی اعتبارات سے آیا ہے لیکن یہاں صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے:-

(الف) امم سابقہ کے احوال و واقعات

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

(الف) امم سابقہ کے احوال و واقعات

قرآن حکیم نے امم سابقہ اور گزشتہ انبیاء کے حوالے سے بہت سے واقعات

وحالات بیان کئے ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر پہلی کتابوں میں سرے سے موجود ہی نہ تھا اور بعض کا ذکر پہلی کتابوں میں تھا لیکن وہ اس قدر محرف و متبدل صورت میں تھا جس کی صحت کے بارے میں کسی کے پاس کوئی یقینی شہادت موجود نہ تھی۔ قرآن نے ان احوال وواقعات اور انبیاء کی تعلیمات وخدمات کو سند تصدیق عطا کردی۔

اس لئے اس کا لقب مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا) قرار پایا۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر حضرت آدم، حوا، نوح، ابراہیم، اسحاق، اسماعیل، یعقوب، یوسف، موسیٰ، خضر، سلیمان، داؤد، یونس، ذوالکفل، صالح، شعیب، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ ومریم علیہم السلام اور اصحاب کہف وغیرہم کے حالات کا بیان ہے۔

ان کے علاوہ قوم ہود، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور دیگر اقوام وملل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، نمرود، قارون اور ہامان وغیرہم کے احوال کا بیان ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں اسی قبیل کے متعدد قصص بیان کئے گئے ہیں۔

کئی علماء نے "قصص الانبیاء" کے موضوع پر باقاعدہ تصانیف رقم کی ہیں۔

اس اعتبار سے قرآن کے اعجاز اور اس کی صحت وحقانیت کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کی زبان سے جس نے کوئی تاریخ پڑھی ہو اور نہ کسی مورخ سے علمی استفادہ کیا ہو، ان احوال وواقعات کا بیان ہونا، پھر اس کا بعض روایات اور تاریخی نقطہ ہائے نظر کی تردید اور بعض کی تصدیق کرنا، بلاشبہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ جب قرآن نے اپنے منکرین ومخالفین کے سامنے خود اپنے بیان کردہ قصص کو انباء الغیب (غیب کی خبریں) سے تعبیر کیا تو کسی بھی دشمن کو یہ جرات نہ ہوسکی کہ ان قصص وواقعات کا کوئی زبانی یا کتابی ماخذ بنا کر قرآن کے اس دعوے کی تردید کرسکتا اور یہ کہہ سکتا کہ "اے محمد ﷺ! تم یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو، حالانکہ تمہیں تو یہ معلومات فلاں ذریعے سے حاصل ہوئی ہیں، لیکن تاریخ عالم شاہد ہے کہ آج تک یہ بات کوئی نہ کہہ سکا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیران کن بیان احوال غیب کا دوسرا پہلو تھا جو مستقبل میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے متعلق تھا۔

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

پیشین گوئی کا طریقہ کسی دعویٰ کی صحت وحقانیت کے اثبات میں سب سے زیادہ نازک اور اہم ہوتا ہے۔ حقانیت قرآن کے داخلی دلائل میں سے یہ دلیل بھی بہت موثر اور فیصلہ کن ہے کہ قرآن نے بعض پیشین گوئیاں ایسے حالات میں کیں جن میں ظاہرا ان کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مخالفین قرآن وپیشین گوئیاں سن کر حیران وششدر رہ گئے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیشین گوئیاں اپنے اپنے وقت پر حقائق و وقائع میں بدلتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ اب تاریخ کا ناقابل انکار حصہ بن چکا ہے جو زبان حال سے قرآن کی صداقت وحقانیت کا اعلان کر رہا ہے۔ ذیل میں چند قرآنی پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں:۔

ا۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی

یہ پیشین گوئی سب سے نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ○ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ (الروم ۳۰: ۱۔۴)	الف، لام، میم۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے۔ چند برسوں میں جن کی حد نو برس ہے۔ حکم اللہ ہی کا ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی۔ یعنی ۶۱۴ء میں جبکہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو بالآخر ۶۱۶ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس جنگ میں بعض مورخین کے مطابق رومیوں کے نوے ہزار (90,000) آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو نذر آتش کر دیا گیا اور سلطنت روم کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ آنحضرت ﷺ نے ایرانی فتوحات کے عین

شباب میں یہ پیشین گوئی کی کہ چند برس کے اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ ہرقل کی حکومت کے یہ سال سلطنت روم کی تباہی وخاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہرحال ان نامساعد ونا موافق حالات میں قرآن نے غلبہ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان کیا اور رومیوں کی فتح یابی کے لئے "**بضع سنین**" کہہ کر نو برس تک کی حد مقرر کردی۔ مستدرک حاکم اور ترمذی کے باب تفسیر سورہ روم میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "**بضع** کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے" اس لحاظ سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی آخر حد ۹ برس مقرر ہوئی۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں بلند آواز سے اس پیشین گوئی کا اعلان کرتے رہے۔

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغاز شکست سے ٹھیک آٹھ برس بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہوگئی۔ وہ اسی کاہل وعشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیر قیادت منظم ہو کر ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نویں برس رومی فتح وکامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایہ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ وفرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے سچ ثابت ہونے پر بے شمار کافر مسلمان ہو گئے۔

۲۔ فتح مکہ کی پیشین گوئی

۶ھ میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں عام بددلی اور مایوسی پائی جاتی تھی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لئے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اطمینان قلب کے لئے قرآن مجید کی اس پیشین گوئی

کا اعلان فرمایا:۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (الفتح، ۱:۴۸)

ہم نے تمہارے لئے عظیم الشان فتح مقدر کردی ہے۔

اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا، جو فتح مکہ کی صورت میں تمہیں حاصل ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی سورت میں فرمایا گیا:۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ (الفتح، ۲۷:۴۸)

بے شک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ اگر اللہ چاہے امن وامان سے اپنے سروں کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہوئے بے خوف ہو کر۔

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتح مکہ کی صورت میں ۸ھ میں ہوا۔ صلح حدیبیہ سے مایوس ہونے والوں نے نتیجتاً اس صلح نامہ کی کامیابی و کامرانی کو دل وجان سے تسلیم کر لیا اور کفار مکہ ہی اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

۳۔ فتح خیبر کی پیشین گوئی

غزوہ خیبر کی فتح کے بارے میں بھی سورہ الفتح میں پیشین گوئی کی گئی۔۔ ارشاد فرمایا گیا:۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ (الفتح، ۱۵:۴۸)

عنقریب کہیں گے پیچھے بیٹھ رہنے والے، جب تم غنیمتیں لینے چلو تو ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دینا۔

جو لوگ حدیبیہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں آئے تھے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ صلح حدیبیہ سے واپس لوٹتے ہوئے اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کو فتح خیبر کی پیشین گوئی بھی دی اور صراحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ غزوہ خیبر میں تمہارے ہاتھ بہت سا

مال غنیمت بھی آئے گا، یعنی ہم نے وہ مال غنیمت صرف ان مجاہدین کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو حدیبیہ کے موقع پر حضور علیہ السلام کے ہمراہ ہیں۔ اس وقت ساتھ نہ دینے والے اس مال غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کی صداقت بھی تاریخ عالم کے صفحات پر نمایاں انداز میں مرقوم ہے، خیبر فتح بھی ہوا اور بے شمار مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

۴۔ غلبۂ اسلام کی پیشین گوئی

سب سے بڑھ کر حیرت انگیز وہ پیشین گوئی ہے جس میں مسلمانوں کو روئے زمین پر عظیم الشان تمکن واستخلاف اور اقتدار واستحکام کی خوشخبری سنائی گئی تھی، حالانکہ اس وقت روم وایران کی دو عظیم عالمی طاقتیں مشرق ومغرب پر اس طرح قابض ومتصرف تھیں، جس طرح آج امریکہ اور روس۔ صحرائے عرب کے ان مکینوں کے بارے میں اس بے سروسامانی کے عالم میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ بھی بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اور موثر طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں کیونکہ دونوں عالمی طاقتیں اس انقلابی قوم کو صفحہ ہستی سے نیست ونابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اندریں حالات قرآن نے اس بشارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا:۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا

(النور، ۲۴:۵۵)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اچھے کام کرنے والوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ ضرور تمہیں زمین میں حکومت دے گا جس طرح پہلوں کو دی تھی اور ضرور ان کے لئے ان کا وہ دین (اسلام) جو اللہ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے، مستحکم کر دے گا اور ضرور ان کے سابقہ خوف کو امن میں بدل دے گا۔

اس پیشین گوئی کا عملی ظہور بھی چشم فلک نے دیکھ لیا۔ عہد رسالت ﷺ میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا' روزافزوں ترقی پذیر رہا۔ عہد خلافت راشدہ میں روم اور ایران سمیت قریباً ۱۰ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ اسلامی سلطنت کے زیر نگین تھا۔ عہد فاروقی میں بلوچستان کی سرحدوں تک مسلمان علم اسلام لے کر پہنچ چکے تھے۔

ابھی اسلام کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ سپین سے آگے سرحد فرانس تک' مشرق میں سندھ اور ملتان تک' مزید برآں ماوراء النہر سے آگے سرحد چین تک وسطی ایشیاء' شمالی افریقہ اور دنیا میں انسانیت کے کثیر ترین حصے پر پرچم اسلام لہرانے لگا۔ سطوت اسلام کا یہ پرشکوہ نظارہ قرآنی وعدے کے مطابق تقریباً چھ سو سال تک قائم ودائم رہا۔ زوال بغداد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر ترکوں کی زیر قیادت ملت اسلامیہ کی سیاسی قوت مجتمع ہوئی اور بالآخر بین الاقوامی سطح پر غلبہ اسلام کا دور پھر چھ سو سال تک منصۂ عالم پر شہود پذیر رہا۔

اس طرح کی پیشین گوئیاں جو قرآن نے بیان کیں اور اپنے اپنے وقت پر عالم خارج میں واقعہ بن کر حقانیت قرآن کی حتمی دلیلیں بنتی رہیں تعداد میں اتنی ہیں کہ ان کا احصاء وشمار آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

قرآنی اعجاز کی دلیل ناطق اس کی ہدایت کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف اپنی ہر دعوت کو حتمی' قطعی اور یقینی طور پر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز قرار دیا ہے بلکہ معیار صداقت وحقانیت بھی نتیجہ خیزی ہی کو قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم میں کامل یقین کے میسر آنے کی جس تدبیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ بہر صورت تجربی توثیق' مشاہدہ حقیقت اور نتیجہ خیزی کے تصور پر مبنی ہے۔ موضوع متذکرہ کی وضاحت سے قبل ضروری ہے کہ نتیجہ خیزی کا مفہوم اور یقین کا تصور اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مطالعہ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کائنات

اس لئے کروایا گیا تھا کہ انہیں یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا جا سکے۔ ارشاد باری ہے:۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ (الانعام ۶: ۷۵)

اور ہم نے اسی طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہتوں کا مشاہدہ کروایا تاکہ وہ صاحب یقین ہو سکے۔

حالانکہ کائنات ارض و سماء کے وجود پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تو پہلے بھی تھا اور یہ بھی یقیناً ان کے ایمان میں شامل تھا کہ آسمان و زمین کی ساری حکومت و سلطنت کا مالک باری تعالیٰ ہے لیکن ایمان کے بعد ایقان کو نتیجہ مشاہدہ پر منحصر قرار دیا گیا۔ اسی طرح باری تعالیٰ کی قدرت اماتت و احیاء پر بھی ابراہیم کا بحیثیت پیغمبر ایمان کامل تھا کہ وہ ذات جس طرح مارتی ہے اسی طرح زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے عرض کیا:۔

رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ ۲: ۲۶۰)

اے میرے رب! مجھے مشاہدہ کروا، تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

اس مطالبہ پر ارشاد باری ہوا:۔

اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (البقرہ ۲: ۲۶۰)

کیا تو اس بات پر ایمان نہیں رکھتا؟

حقیقت یہ ہے کہ ذات حق بھی اس امر سے بے خبر نہ تھی کہ ابراہیمؑ میری قدرت پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن سوال کیوں کر رہے ہیں۔ قدرت باری پر ایمان کے بغیر پیغمبری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور ابراہیمؑ تو جد الانبیاء تھے۔ یہ سوال وجواب محض اس مقصد کے لئے تھا کہ خلق خدا ادھر متوجہ ہو اور قدرت الٰہیہ کے معروضی نتیجے کا مشاہدہ کر کے حضرت ابراہیمؑ کی طرح دولت یقین سے بہرہ ور ہو سکے۔

آپ نے عرض کیا:۔

قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (البقرہ ۲: ۲۶۰)

انہوں نے جواب دیا (اے باری تعالیٰ) ایمان تو رکھتا ہوں لیکن مشاہدے سے اطمینان قلب چاہتا ہوں۔

چنانچہ آپ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق پرندوں کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑوں کو مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر متفرق طور پر رکھ دیا اور انہیں ندا دی تو وہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ جب انہوں نے حکم الٰہی کی یہ نتیجہ خیزی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو فرمایا گیا:۔

وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ — پس اب جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔
(البقرہ ۲:۲۶۰)

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام نے بھی مردوں کے زندہ ہونے کے امر کا معروضی نتیجہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ انہیں سو سال کی عارضی موت کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔ ان کی سواری کو ان کے سامنے مٹی میں سے زندہ کیا گیا اور دوسری طرف انہیں یہ بھی دکھایا گیا کہ سو سال گزر جانے کے باوجود ان کا کھانا ابھی باسی نہ ہوا تھا۔ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے یہ نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حضرت عزیر علیہ السلام فرمانے لگے:۔

أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ — میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
(البقرہ ۲:۲۶۰)

مشاہدۂ نتائج سے حاصل ہونے والا یہ علم ایمان کے لئے نہ تھا کیونکہ ایمان بالغیب تو پہلے ہی موجود تھا۔ یہ علم حصول ایقان کے لئے تھا۔

مذکورہ بالا تین واقعات سے استشہاد و استدلال کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن مجید کے نزدیک یقین، نتیجہ خیزی کی اس ضمانت کا نام ہے جو معروضی نتائج کے مشاہدے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے:۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ — اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے معروضی کامیابی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت میسر آ جائے۔
(الحجر ۱۵:۹۹)

اسی مشاہدے کی منزل کا نام یقین ہے جس تک پہنچنے کے لئے حکم عبادت دیا جا رہا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر کسی کے پیش کردہ نظریہ علم میں ایجابی اور منفی دونوں

طرز کے نتائج پیدا کرنے کی ضمانت موجود ہو تو اس علم کو یقینی علم کہا جائے گا اور یہی خوبی قرآنی علم وہدایت کا طرۂ امتیاز ہے۔

یقین اور نتیجہ خیزی کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد قرآن مجید کا یہ اعجاز اور اس کی حقانیت کی یہ داخلی دلیل سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ قرآن میں نتیجہ خیزی کی ضمانت کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے سلسلہ علم وہدایت کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا ہر دعویٰ تجربی توثیق کی بنا پر معروضی نتائج پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ اس سلسلے میں چند ارشادات قرآنی ملاحظہ ہوں۔

○ قرآنی ہدایت کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو دنیا و آخرت میں خوف و غم کی محیط کیفیت سے نجات دلا دی جائے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اس دعوئ کی نتیجہ خیزی کا بیان اس طرح کیا:۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ، ۲:۳۸)

پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آ جائے تو تم میں سے جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا پس اس کو نہ کوئی خوف رہے گا اور نہ کوئی غم۔

○ اسی طرح قرآن إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (بیشک خدا کا گروہ ہی غالب ہونے والا ہے) کا اعلان کر کے اس دنیا میں باطل کے مقابلے میں غلبہ دین کا دعوئ کرتا ہے۔ یہ دعوئ محض اس لئے نہیں کیا گیا کہ مسلمان اس کی آرزو تو کر سکیں لیکن اس کی عملی اور واقعاتی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس امر کی ضمانت بھی ساتھ ہی مہیا کر دی گئی:۔

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ (آل عمران، ۳:۱۳۹)

تم پست ہمت نہ ہونا اور نہ غم کرنا، بیشک تم ہی غالب آؤ گے۔ اگر تم (صحیح طور پر) صاحب ایمان رہے۔

○ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ

پس تم سستی نہ کرو اور نہ باطل سے

الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (محمد ۴۷:۳۵)

... پھر تم ہی غالب آکر رہو گے' اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہاری کوششیں بے نتیجہ (یا خسارے میں) نہیں جانے دے گا۔

○ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ (المائدہ' ۵:۵۶)

اور جو اللہ' اسکے رسول اور مسلمانوں کو (صحیح معنوں میں) دوست بنائے بیشک (وہی) اللہ کا گروہ (ہے جو) غالب و کامیاب ہوگا۔

○ اس امر کی مزید وضاحت درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ (الصفت' ۳۷:۱۷۱۔۱۷۳)

اور بے شک ہمارا یہ وعدہ اپنے ان بندوں کے ساتھ جو انبیاء و رسل تھے پہلے ہی سے ہو چکا ہے یقیناً ہماری مدد و نصرت انہی کو حاصل رہی ہے اور یقیناً ہمارا ہی لشکر (یعنی گروہ) باطل کے مقابلے میں ہمیشہ غالب آتا ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا کا وعدہ محض دعوے سے نہیں بلکہ فی الواقع اس کارگہ حیات میں حق و باطل کے درمیان ہونے والی کش مکش میں اہل حق کو غالب اور فتحیاب کر دینے سے ہی پورا ہو سکتا ہے اور یہی دعوی قرآن کی نتیجہ خیزی ہے۔

○ قرآن مجید انبیاء ماسبق کے حوالے سے اقوام حق و باطل کی منظم کش مکش کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے:۔

وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ

اور ہر گمراہ قوم نے اپنے رسول کے بارے میں ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں

فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○ وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ○

(المومن، ۴۰:۵-۶)

(یعنی شکست دے دیں) اور وہ باطل قوت کے ذریعے اس سے جھگڑتے بھی رہتے تاکہ اس کوشش سے حق کی تاثیر اور نتیجہ خیزی کو زائل کر دیں (یعنی نتائج کے اعتبار سے پیغمبرانہ جدوجہد کو ناکام بنا دیں) لیکن ہوا یہ کہ میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے کر شکست دے دی۔ پس میری سزا کیسی تھی؟ اور (جس طرح اس دنیا میں میرا یہ وعدہ کہ حق کو فتح اور باطل کو ذلت آمیز شکست ہوگی، نتائج کے لحاظ سے سچا ثابت ہوا) اسی طرح تیرے رب کی یہ بات بھی کفار پر حق ثابت ہوگئی کہ وہی آگ میں جلیں گے۔

اگر اس آیت کے مضمون پر غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قرآن نے اس دنیا میں اہل حق کی نتیجہ خیز کامیابی کو آخرت کی کامیابی کی دلیل قرار دیا ہے۔ جو قرآن آخرت میں اہل حق کی کامیابی اور اہل باطل کی ذلت و رسوائی کے تصور کی حقانیت و صداقت کے لیے اس دنیا میں وعدۂ غلبۂ حق کی تکمیل کو بطور ثبوت پیش کر رہا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قرآن نے اپنے ہر دعوے کی صداقت اور اس دنیا میں اس کی نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا نہ کی ہوگی۔ عقل سلیم اس امر کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔

جو ذہن اس تصور پر قانع اور مصر ہے کہ "جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں اس دنیا میں اس کی کوئی ضمانت نہیں، یہاں کی کامیابی کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے" وہ دین حق کی صحیح معرفت سے

محروم ہے اور وہ لاشعوری طور پر قرآنی ہدایت کی عظمت اور صداقت و حقانیت کا انکار کر رہا ہے۔ یہی پہلو تو درحقیقت قرآنی اعجاز کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کا کیا ہوا ہر وعدہ اسی دنیا میں نتیجہ خیزی کے ذریعے اپنی صحت و صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور یہاں معروضی نتائج کا مشاہدہ کروا کر تنبیہ کرتا ہے کہ اسی طرح آخرت میں بھی کامیابی اہل حق کو اور ناکامی اہل باطل کو نصیب ہو گی۔ قرآن کا ہر دعوی ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حقیقت ہے، شاعرانہ تعلی نہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا:۔

وَمَآ عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝
(یٰسین، ۳۶:۶۹)

اور ہم نے رسول ﷺ کو شعر نہیں سکھائے اور نہ وہ ان کے شایان شان تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی نصیحت ہے اور روشن قرآن ہے۔

اس آیت کے ذریعے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ قرآن کے دعاوی اور اعلانات شاعرانہ تعلی نہیں ہیں جن کا عملی زندگی اور نتیجہ خیزی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو، بلکہ یہ تو ایسی کھلی اور روشن حقیقتیں ہیں جو خود ہی اپنی صداقت و حقانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی تاثیرات و خصوصیات کا ذکر مختلف عنوانات کے ذریعے کیا ہے۔ اگر ان کی معنوی دلالت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہر عنوان کے تحت اپنی کسی نہ کسی فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حیثیت کو بیان کر رہا ہے۔ مثلاً

○ قرآن --- ہدایت ہے ----- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء، ۱۷:۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تاریکی و ظلمت اور بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر منزل مقصود تک پہنچا دینے کی حتمی و قطعی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- تصدیق ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (یوسف، ۱۲:۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن صحف ماقبل کی آسمانی حیثیت اور ان کے احکام و تعلیمات کی حقانیت کی فیصلہ کن ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- تفصیل و تبیین ہے -----اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف ' ۱۲:۱۱۱) اور وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ (النحل ' ۱۶:۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حقائق کائنات کے تمام گوشوں کی تفصیلی وضاحت اور علمی و فکری تشکیک کے خاتمے کی یقینی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- رحمت ہے ------اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (یوسف ' ۱۲:۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو انفرادی ' اجتماعی ' قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کی سیاسی ' معاشی اور معاشرتی اذیت سے نجات کی اطمینان بخش ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- شفا ہے ------اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (یونس ' ۱۰:۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن ہر فرد اور معاشرے کو داخلی و خارجی اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے امراض و مصائب سے کلی نجات کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- موعظت ہے ------اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ (یونس ' ۱۰:۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تنبیہہ ' تنذیر اور تبشیر کی صورت میں نفسیاتی تبلیغ کے ذریعے شعور انسانی کو طلب کمال اور اس کے حصول کی حتمی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- بشارت ہے ------اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ (النحل ' ۱۶:۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن دنیاو آخرت میں خیر اور حق کو شر اور باطل کے مقابلے میں فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کی بشارت انگیز ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- فرقان ہے ------اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ' ۲:۱۸۰) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان واضح نتیجہ خیز اور فیصلہ کن امتیاز کے ظہور کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- مخرج من الخوف والحزن ہے ------ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲: ۳۸) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن فرد اور معاشرے کو اپنی پیروی کی صورت میں ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خوف و غم سے بے نیاز کر دینے کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ قرآن ---- روشن کتاب ہے ------ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:۔

تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (النمل ۲۷: ۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن واضح اور فیصلہ کن انداز میں غلبہ حق کی جدوجہد کے تمام مراحل کے لیے جملہ تفصیلات اور قطعی نتیجہ خیزی کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی حیثیات جہاں اپنی تاثیر اور افادیت کے لحاظ سے عام ہیں وہاں ان کا فیضان بھی عام ہے اور فیصلہ و نتیجہ بھی۔ خواہ اس ابدی اور آفاقی اصول اور ضابطے کو مسلمان اپنا لیں یا غیر مسلم۔ چونکہ قرآن کا فیضان کائناتی ہے اور اس کا دائرہ خطاب بھی آفاقی ہے۔ لہٰذا بلا امتیاز رنگ و نسل اور علاقہ و مذہب جو قوم و ملت اور طبقۂ افرادِ انسانی، قرآنی تعلیم اور ہدایت کے جس گوشے کو عملاً اپنا لے گا، قرآن کا فیصلہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے اسی کے حق میں ناطق اور نتیجہ خیز ہو گا۔ قرآنی تعلیمات اپنی نفع بخشی اور فیض رسانی کے باب میں کسی کے لیے بھی جانب دار نہیں ہیں۔

اس نکتے کی وضاحت سے یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ آج مسلمان قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود عالم کفر کے مقابلے میں شکست خوردہ، ناتواں اور پریشان حال کیوں ہیں۔

قرآنی تعلیمات کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ خیزی ان پر محض ایمان لانے سے نہیں بلکہ ان کو انسانی زندگی میں واقعہ بنانے سے میسر آتی ہے۔ ایمان کا دعوی کرنے والے اگر ان تعلیمات کو عملاً خیرباد کہہ چکے ہوں اور کفر و طاغوت کے علمبردار اپنی زندگی کے بعض گوشوں میں ان تعلیماتی حقائق کو عملاً واقعہ بنا چکے ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس کائناتی کتاب کی نتیجہ خیز ہدایت کے فیضان سے محروم رہیں۔ قرآنی ہدایت کی

نتیجہ خیزی کا وعدہ بالعموم اس کی تعلیمات کے حوالے سے ہے نہ کہ افراد و طبقات کے حوالے سے' اس لیے جو کوئی بھی کسی مخصوص قرآنی تعلیم کی نتیجہ خیزی کی شرائط کو پورا کیے بغیر نتیجہ خیزی کی آرزو کرے گا یہ آرزو محض عبث ہوگی اور جہاں تک اخروی فلاح کا تعلق ہے تو وہ ہے ہی صرف مومنین و صالحین کے لیے۔ اس لیے اس میں سے ہر ایک برابر حصہ نہیں لے سکتا۔ قرآنی ہدایت و تعلیمات اور اس کے اصول و ضوابط کے درمیان مذکورہ بالا امتیاز کو سمجھ کر ہر سوال کا تسلی بخش جواب میسر آسکتا ہے۔ اگر قرآن کے بیان کردہ تمام ضابطوں کی افادیت' تاثیر اور نتیجہ خیزی صرف ایک کلمہ گو طبقے تک محدود کر دی جائے تو اس کی آفاقی و کائناتی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن پوری نوع انسانی کی رہنمائی اور فلاح و بہبود کے لیے نازل ہوا ہے اور رسالت محمدی ﷺ کی دعوت بھی اسی طرح عالم گیر ہے۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے:۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف' ۷:۱۵۸)	اے نسل بنی آدم! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔

چنانچہ جو کوئی جتنا قرآنی ہدایت کو عملاً قبول کرے گا وہ اسی قدر حصہ پالے گا۔ اسی "قرآنی نتیجہ خیزی کی ضمانت" کا نام مشیت الٰہی ہے۔ رب ذوالجلال نے آفاقی اصول و ضوابط بنی نوع انسان کو عطا کر دیئے ہیں اور انہیں ان کے ردو قبول میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جو کوئی ان پر عمل کرے گا یا ان سے انحراف کرے گا' مقررہ ایجابی اور منفی نتائج بھگت کر رہے گا۔ مسلم ہو یا غیر مسلم مشیت الٰہی کے اس نتیجہ خیز فیصلے سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا۔ قرآنی ہدایت کی یہ خوبی اس کی حقانیت اور اعجاز کی ایسی ابدی دلیل ہے جس کا مشاہدہ آج بھی زوال پذیر ملت اسلامیہ کر رہی ہے۔

غیر اسلامی قوتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سیاسی' معاشی اور معاشرتی پستی نے جب انہیں ذہنی اور فکری طور پر بھی مضمحل کر دیا تو ان کی سوچ ہر لحاظ سے ناامیدی کا شکار ہو گئی اس مایوسی کی بنا پر شعوری یا لاشعوری عمل کے باعث ان تین تصورات نے جنم لیا:۔

○ ایک یہ کہ خالصتاً اسلام کے قابل عمل ہونے کی نسبت اعتماد باقی نہ رہا۔ بنابریں انداز فکر یہ ہو گیا کہ اسلام چودہ سو سال پہلے کی تہذیب ہے' اس کے تہذیبی و سماجی فضائل اور سیاسی و معاشی ضوابط آخر آج کے بدلے ہوئے حالات میں کیوں کر قابل عمل ہو سکتے ہیں۔

○ دوسرے یہ کہ مستقبل میں مسلمانوں کے احیاء اور دوبارہ عروج حاصل کر سکنے کی کوئی امید اور تدبیر باقی نہ رہی۔ ارباب علم و دانش کا ذہن اس بات پر مطمئن ہو گیا کہ ہزار بارہ سو سال سے زائد عرصہ تک پوری دنیا پر حکمرانی کر لینے کے بعد زوال ایک فطری امر تھا۔ اسلام کے غلبہ و عروج کی یہی عمر طبعی تھی جو اس نے پوری کر لی۔ اس سے زائد مدت کے لیے اس کے غلبے کا باقی رہنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اب اس میں وہ قوت' فعالیت اور تاثیر باقی نہیں رہی جو مستقبل میں مسلمانوں کے از سر نو احیاء کی ضمانت دے سکے۔

○ تیسرے یہ کہ قرآن و سنت کی ہدایت کی نسبت نتیجہ خیزی کا یقین ختم ہو گیا۔ مذہبی ذہن نے اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ خیال وضع کر لیا کہ اس پر عمل پیرا ہونا محض اخروی فلاح کا ضامن ہے۔ اس کا نتیجہ آخرت کے اجر و ثواب کی صورت میں متحقق ہو گا اور یہی اصل کامیابی ہے۔ دنیا میں معروضی نتائج کا حصول ضروری نہیں۔ اس کارگہ حیات میں ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق عمل اور جدوجہد کرتے چلے جائیں۔ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں' کامیابی ظاہراً حق کو ہو یا باطل کو' اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں' کیوں کہ نتیجہ خیزی کی ضمانت ہمیں نہیں دی گئی اور نہ ہی نتیجہ خیزی معیار صداقت و حقانیت ہے۔ صرف آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔

موضوع زیر بحث اس تیسرے تصور سے متعلق ہے کہ ایک خاص مذہبی ذہن نے قرآن و سنت کی ہدایت سے نتیجہ خیزی اور معروضی و واقعاتی کامیابی کی ضمانت کا تصور اس لیے خارج کر دیا کہ اس کی اپنی جدوجہد مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکی۔ سیاسی' سماجی اور معاشرتی سطح پر غیر اسلامی قوتوں کا اثر و نفوذ اس کی کوششوں سے کم نہیں ہو

سکا۔ باطل طاغوتی طاقتوں اور قوتوں کے مقابلے میں اسلام کے نام پر کی جانے والی کاوشیں مطلوبہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں۔ اندریں صورت دو ہی رد عمل ممکن تھے:۔

○ ایک یہ کہ اپنے پروگرام اور طریق کار کو ناقص اور اصلاح طلب تصور کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے۔

○ دوسرے یہ کہ اسلام اور قرآن و سنت کی ہدایت میں سے کامیابی اور نتیجہ خیزی کا تصور حذف کر لیا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے کامیابی یا ناکامی کوئی فیصلہ کن امر نہیں ہے۔ اس سے پروگرام کی صحت و عدم صحت، یا صداقت و عدم صداقت متعین نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے ہمیں صرف جدوجہد کے لیے مامور اور مکلف کیا ہے، نتائج کا معاملہ ہمارے سوچنے کا نہیں۔

اس ذہن نے باطل کے مقابلے میں اپنی شکست کی خفت و ندامت کو چھپانے کے لیے دوسرا موقف اختیار کر لیا اور اس کو اسلامی تصور کا نام دے دیا۔ مستزاد یہ کہ باوجود ناکامی کے اپنی فکری و عملی قیادت کو بحال رکھنے کی خاطر اس نے ایک ظلم یہ بھی کیا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر تبلیغی جدوجہد اور پیغمبرانہ مساعی کے باوجود نتائج کے لحاظ سے ناکامی کا الزام لگا دیا اور اس امر کا پرچار کیا گیا کہ ہزاروں انبیاء کرام دنیا میں تشریف لائے۔ انھوں نے مسلسل جدوجہد کی پے در پے کوششیں کیں۔ لیکن معروضی نتائج کے لحاظ سے کامیابی حاصل نہ کر سکے اور وہ معاذ اللہ ناکام ہو کر واپس اپنے مالک سے جا ملے۔

یہ نقطۂ نظر محض اپنی مدافعت کے لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب خدا کے برگزیدہ انبیاء نتیجتاً ناکام ہوتے رہے ہیں تو ہماری ناکامی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس تصور کو قرآن کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

پیغمبرانہ جدوجہد کو نتائج کے لحاظ سے ناکام سمجھنے والے ذہن نے بزعم خویش انکی ناکامی کے اسباب بھی تلاش کر لیے کبھی انکی محض انفرادی کوششوں کو (معاذ اللہ) ان کی ناکامی کا سبب قرار دیا گیا یعنی وہ اس لیے مقصد حاصل نہ کر سکے اور اپنے اپنے ادوار میں اسلامی نظام نافذ نہ کر سکے کہ ان کی جدوجہد اجتماعی طور پر بھرپور انداز سے نہ

ہوئی تھی۔ کبھی تنظیم کے فقدان اور کبھی تربیت یافتہ جتھے اور گروپ کے فقدان کو ان کی ناکامی کی وجہ تصور کیا گیا۔

علی ہذا القیاس انسانی ذہن اپنی قیادت کے تحفظ اور ندامت سے بچاؤ کی خاطر خدا جانے کیا کیا کچھ نہ کہہ گیا۔ گویا ہزاروں انبیاء اس طرح یکے بعد دیگرے ناکام ہوتے رہے لیکن اس گروہ انبیاء میں سے کوئی نبی بھی ناکامی کے اسباب کو سمجھ کر ان کا تدارک اور ان کا دفاع نہ کر سکا اور نہ ہی (معاذ اللہ) خالق کائنات جو ان انبیاء کو مبعوث کر رہا تھا خود اس امر کو متعین کر سکا کہ میرے انبیاء و رسل، کفار و مشرکین عالم اور منکرین حق کے مقابلے میں نتائج کے لحاظ سے مسلسل ناکام واپس لوٹ رہے ہیں۔ اس طرح میری ہدایت کا مذاق ہو رہا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور اس کا سدباب کس طرح ہو سکتا ہے تاکہ جس مقصد کے لیے انبیاء کو بھیجا جا رہا ہے وہ اس میں کامیاب لوٹ سکیں۔

اگر یکے بعد دیگرے سینکڑوں انبیاء کو (معاذ اللہ) ایسی بے نتیجہ جدوجہد کے لیے دنیا میں بھیجنا تھا کہ باطل کو شکست ہی نہ دی جا سکے تو آخر اس کارروائی کا مقصد کیا تھا؟ کیا (معاذ اللہ) صرف انبیاء و رسل اور آسمانی ہدایت کی تضحیک مقصود تھی؟ یقیناً نہیں۔ ایسا سوچنا بھی کفر ہے اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ہمیں انبیاء کی جدوجہد کی نسبت نتائج کے لحاظ سے ناکامی کے مفروضے کو غلط اور بے بنیاد قرار دینا ہو گا اور اس امر کا اعتراف کرنا ہو گا کہ کوئی بھی نبی نتائج کے لحاظ سے کبھی ناکام واپس نہیں لوٹا بلکہ پیغمبرانہ جدوجہد کے بے نتیجہ ہونے کا تصور ہی خلاف اسلام ہے اور قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ایسا خیال ہرگز اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا۔

یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ قرآن حکیم میں بعض انبیاء سابقین جن میں نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ، لوطؑ، اور اسی طرح چند دیگر اسماء بطور خاص قابل ذکر ہیں، کے بیان کیے گئے حالات کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا۔ ہم اسلام کے سیاسی غلبے اور نفاذ کو بلا امتیاز ہر نبی کے مقصد بعثت کے طور پر بربنائے قیاس از خود متعین کر لیتے ہیں کہ ہر نبی کم

از کم اسی کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوا ہو گا۔ یہ تصور ہمارا خود تراشیدہ ہے اور پھر اس خود ساختہ تصور کی بنیاد پر ہم ان کی جدوجہد کا مطلوبہ نتیجہ دوٹوک انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو حسب خواہش دکھائی نہیں دیتا تو ہم اس پر ظاہری ناکامی کا الزام دھر دیتے ہیں۔ یہ انداز جستجو ہی غلط ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر نبی کا مقصد بعثت' اس کی جدوجہد کا رخ اور غرض و غایت از خود متعین کرنے کے بجائے خود انہی انبیاء کی زبانی قرآن سے متعین کریں کہ وہ اپنے مقصد بعثت کے بارے میں خود کیا بتاتے ہیں اور پھر ان کے اپنے بیان کردہ مطمع نظر اور مقصد جدوجہد کی روشنی میں قرآن سے نتائج کے مبینہ طور پر پیدا ہونے یا نہ ہونے کا سوال کریں اس طرح کسی کی کامیابی یا ناکامی کو صحیح طور پر جانچا جا سکتا ہے۔

جب بھی کوئی نبی کسی قوم یا طبقے کی طرف بھیجا گیا اس نے سب سے پہلے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا کہ میں تمہارے پاس اس کام کے لیے آیا ہوں اور مجھے یہ معاملہ سرانجام دینا ہے۔ میری بات مان لو' جو کوئی میری بات مانے گا اسے فائدہ پہنچے گا اور جو شخص انکار کرے گا نقصان اٹھائے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ انجام کار اس کی کامیابی یا ناکامی کو اس کی جدوجہد کے آغاز میں کئے گئے اعلان اور چیلنج کی روشنی میں پرکھا جائے گا کہ جو دعوی اس نے شروع میں کیا تھا۔ کیا واقعی ایسا ہوا یا نہیں؟ کیا اس کا چیلنج پورا ہو سکا یا نہیں؟ اس کی بات نتیجے کے لحاظ سے سچی ثابت ہوئی یا نہیں؟

اگر روز اول کا کیا ہوا چیلنج پورا ہو گیا تو جدوجہد نتیجہ خیز' فیصلہ کن اور کامیاب قرار پائے گی اور اگر چیلنج پورا نہ ہو سکا تو بے نتیجہ اور ناکام تصور ہو گی۔ آیئے اب اسی کسوٹی کے ذریعے قرآن حکیم میں سے "پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج" کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں قرآن مجید کا یہ دعویٰ بھی پیش نظر رہنا چاہیے:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَ رُسُلِيْ
(المجادلہ ۵۸: ۲۱)

اللہ تعالیٰ نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہمیشہ میں اور میرے رسول ہی اپنی جدوجہد

میں کامیاب اور غالب رہیں گے۔

اس دو ٹوک فیصلہ الٰہی کے بعد اس امر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ کسی دور میں بھی کسی پیغمبر کی جدوجہد باطل کے مقابلے میں بے نتیجہ رہی ہو اور اسے اسی دنیا میں اپنی جدوجہد کے نتیجے میں واضح اور مبینہ کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔ انبیاء کے حق میں وعدہ الٰہی کا پورا ہونا یہی ہے کہ وہ حق کے لیے جدوجہد کریں' باطل قوتیں ان کی راہ میں مزاحم ہوں' باطل کی کوششیں پیغمبرانہ جدوجہد کو ناکام بنا دینے کی خاطر ہوں لیکن اس مقصد میں وہ خود ناکام ہو جائے اور پیغمبرانہ جدوجہد کا اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کر کے رہے۔ گویا حق و باطل کے اس تصادم میں پیغمبرانہ جدوجہد کا اپنے نتائج کے اعتبار سے کامیاب و کامران ہونا ہی احقاق حق اور ابطال باطل کی واحد صورت ہے۔ اس لحاظ سے پیغمبرانہ جدوجہد کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ معیار صداقت قرار پا گئی۔ اگر پیغمبرانہ جدوجہد کے قرآنی فلسفہ پر غور کیا جائے تو بلاشک و شبہ یہ حقیقت منظرعام پر آجاتی ہے کہ حق کی کامیابی یہی ہے کہ حق اور باطل کی دو قوتیں باہم برسرپیکار ہوں' دونوں کے پیچھے ایک ایک منظم ارادہ کار فرما ہو' ایک اتمام نور حق کا اور دوسرا اطفاء نور حق کا' (یعنی نور حق کو مکمل کرنے اور نور حق کو بجھا دینے کا) اتمام نور حق کے ارادے سے مراد یہ ہوا کہ پیغمبرانہ جدوجہد یا حق کی قوت معروضی نتائج کے اعتبار سے کامیاب ہو اور دنیا اس کا کھلا ہوا مشاہدہ کر لے اور اطفاء نور حق کے ارادے سے مراد یہ ہوا کہ حق یا پیغمبرانہ جدوجہد اپنے چیلنج کو پورا نہ کر سکے اور نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن انجام کار پیغمبرانہ جدوجہد اپنے نتائج کو پہنچ جائے اس کا چیلنج پورا ہو چکے اور اس طرح اس کا حق ہونا تجربی توثیق کی بنیاد پر ہر ایک کے سامنے آشکار ہو جائے اور باطل قوتیں دنیا میں ہی اس انجام کو پہنچ جائیں جس کا وعدہ انبیاء کے چیلنج میں کیا گیا تھا۔

پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج کے اس اصول کو قرآن یوں واضح کرتا ہے:۔

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ

اہل باطل یہ چاہتے ہیں کہ نور حق کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کو ایسا ہرگز

وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ○

(التوبہ ۹: ۳۲)

گوارا نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ وہ عالم کفر کی مخالفت و مزاحمت کے باوجود اپنے نور کو پورا کر دے (یعنی اسے مطلوبہ منزل اور نتیجے تک پہنچا دے)

اسی اصول کی مزید وضاحت قرآن سے ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ○ (الانفال ۸: ۷-۸)

اور اللہ کا ارادہ ہے کہ اپنے وعدوں کے ساتھ حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کو جڑ سے کاٹ دے تاکہ حق کا سچ ہونا اور باطل کا جھوٹ ہونا آشکار ہو جائے گو مجرم اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

اس آیت میں بھی حق کا غالب آنا اور باطل کا نتیجتاً شکست کھا جانا احقاق حق اور ابطال باطل کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ امر طے ہو گیا کہ پیغمبرانہ جدوجہد کا اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب ہونا احقاق حق کے لیے ضروری ہے' ورنہ دنیا میں کلمات الہیہ کی صحت کا کوئی فیصلہ کن طبعی ثبوت فراہم نہ ہو سکے گا۔ قرآن نے انبیاء سابقین کے حوالے سے اس امر کی وضاحت یوں کی ہے:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ○ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ○ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ○

(فاطر ۳۵: ۲۴-۲۶)

اور کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں ڈر سنانے والا نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کوئی بات نہیں اس سے پہلے لوگ بھی جھٹلاتے رہے ہیں۔ ان کے پاس بھی ان کے رسول کھلے دلائل' صحائف اور روشن کرنے والی کتاب (یعنی واضح اور نتیجہ خیز پروگرام) لے کر آئے تھے جن کی انہوں نے مخالفت کی۔ لیکن میں نے انہیں پکڑ

لیا (یعنی انہیں ناکام بنا دیا) پس میرا
عذاب اور گرفت حق کا انکار کرنے
والوں کے لیے کیسی تھی۔

مندرجہ بالا قرآنی آیات کا ایک ایک لفظ کتنے واشگاف انداز میں اس حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے کہ پیغمبرانہ جدوجہد کبھی کسی دور میں بھی بے نتیجہ نہ رہی۔ اس کے نتائج کا پیدا کرنا خود غیرت الٰہیہ کا تقاضا تھا اس لیے وہ نتیجہ خیز ہوتی رہی اور ہر باطل قوت جو اس سے ٹکرائی نہ صرف خود ناکام و نامراد ہو گئی بلکہ اس کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اسی سورت میں انبیاء ماسبق کی دعوت کی نتیجہ خیزی بیان کرتے ہوئے قرآن نے اعلان کیا۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
(فاطر ۳۵:۵)

اے بنی نوع انسان! خدا کا وعدہ حق ہے۔ (اسے دنیا کی کوئی طاقت غلط ثابت نہیں کر سکتی)

اب اسی فلسفے کی روشنی میں سورہ ہود کا مطالعہ فرمایئے۔ انبیاء سابقین کی جدوجہد اور اس کے نتائج کے بارے میں جتنے شبہات پیدا ہو سکتے تھے آیت نمبر ۲۵ سے ۱۲۳ تک تمام کا تسلی بخش جواب آگیا ہے۔

حضرت نوحؑ ہوں یا حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ ہوں یا حضرت شعیبؑ، حضرت لوطؑ ہوں یا حضرت موسیٰؑ، ہر پیغمبر نے مبعوث ہوتے ہی اپنی قوم کے سامنے اپنی بعثت کا متعین مقصد بیان کر دیا اور کہا کہ میرے ذمے صرف دو چیزیں لگائی گئی ہیں:۔

- ایک یہ کہ پیغام حق تم تک پہنچا دوں۔
- دوسرے یہ کہ اس کی حقانیت، صداقت اور نتیجہ خیزی کا مشاہدہ تمہیں اسی زندگی میں کرا دوں۔

دعوت کے دوسرے پہلو کے لئے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو چیلنج کیا۔ "جو کوئی میری اطاعت کرے گا۔ میرے پروگرام کی تائید کرے گا اور میری جدوجہد میں شریک ہو جائے گا وہ نجات یافتہ ہو گا اور جو میری مخالفت کرے گا اور حق کے راستے میں مزاحم

ہو گا اسی دنیا میں اور میری زندگی میں ہی تباہ و برباد اور نیست و نابود ہو جائے گا"

ہر پیغمبرانہ جدوجہد اور دعوت کا آغاز اس چیلنج سے ہوا تھا اور پورے قرآن سے ایک شہادت بھی ایسی میسر نہیں آسکتی کہ کسی پیغمبر کی جدوجہد کے نتیجے میں یہ چیلنج پورا نہ ہوا ہو۔ جس جس نے پیغمبرانہ دعوت کو قبول کر لیا بامراد رہا اور جس جس نے اس کی مخالفت کی اور مزاحمت سے باز نہ آیا تاریخ عالم اور چشم فلک شاہد ہے کہ وہ اسی پیغمبر کی زندگی میں ہی تباہ و برباد ہو گیا انکار کرنے والی قومیں مٹ گئیں۔ کچھ طوفانوں کی نذر ہو گئیں، کچھ بلندی سے گر کر تہ و بالا ہو گئیں، کچھ پتھروں کے عذاب سے ختم کر دی گئیں، کچھ کی شکلیں مسخ ہو گئیں، کچھ خوفناک آواز اور چنگھاڑ سے تباہ ہو گئیں، کچھ سمندروں میں غرق ہو گئیں اور کچھ قتل و غارت کی نذر ہو گئیں۔

الغرض پیغمبرانہ جدوجہد کے دونوں قسم کے نتائج ہر دور میں بر آمد ہوئے اطاعت گزار محفوظ ہو گئے اور منکرین نیست و نابود۔ یہ نتائج بعد میں آنے والی اقوام و ملل کے لئے سامان عبرت تھے یہ ساری تاریخ پیغمبرانہ جدوجہد اور انبیاء و مرسلین کی کامیابی و کامرانی کی تاریخ تھی اسے ان کی ناکامی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(ھود، ۱۱: ۱۲۰)

اور یہ سارے کے سارے واقعات جو ہم احوال رسل میں سے آپ کو سناتے ہیں یہ صرف اس لئے سناتے ہیں کہ ان سے آپ کے دل کو تقویت پہنچے اور اس قرآن میں آپ کے پاس حق (کا نکھرا ہوا تصور) آگیا اور مومنین کے لئے عبرت و نصیحت۔

بات بڑی واضح ہے اگر انبیاء کی تاریخ (معاذ اللہ) ان کی ناکامیوں کی تاریخ ہوتی تو اس کے بیان سے حضور ﷺ کے قلب مبارک کو تقویت نہیں بلکہ تکلیف اور مایوسی ہوتی حالانکہ قرآن اس کے ذکر کو باعث تقویت و فرحت قرار دے رہا ہے۔

اس لئے پیغمبرانہ جدوجہد کی ساری تاریخ کامیابی و کامرانی کی تاریخ ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے عبرت و نصیحت بھی کہ انہیں یہ علم ہو جائے کہ دعوت انبیاء کو ٹھکرانے والے اس طرح نیست و نابود ہو گئے اور ان کے اطاعت گزار اس اس طرح سرخرو ہوئے۔

قرآن نتیجہ خیز تاریخی لائحہ عمل کا نام ہے

بنابریں قرآن اپنے دعووں اور ان کی نتیجہ خیزیوں کی ایسی تابناک اور یقین انگیز تاریخ بیان کرتا ہے کہ اس سے احوال زندگی سنوارنے کا حتمی و قطعی لائحہ عمل میسر آجاتا ہے۔ آج مطالعہ تاریخ میں اس لئے کوئی جان' ولولہ اور اثر انگیزی باقی نہیں رہی کہ یہ صرف اقوام و ملل کی ترقی و انحطاط کی داستان سے مختص ہو کر رہ گیا ہے قرآن کے نزدیک تاریخ مختلف اقوام کے حالات کے ایسے عبرت انگیز جائزے اور مشاہدے کا نام ہے جس سے اپنی ملت کا مستقبل سنوارنے کی نہ صرف امنگ پیدا ہو بلکہ واضح لائحہ عمل بھی متعین ہو سکے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝
(الحج' ۲۲:۴۶)

کیا انہوں نے زمین میں سیروسیاحت نہیں کی کہ (شاید ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ سمجھ سکتے یا کان (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ (حق کی بات) سن سکتے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ قرآن کے مطابق دل بینا سے نہیں کر رہے بلکہ اپنے ماضی کا جائزہ ایسی بے بصیرتی سے لے رہے ہیں جس میں مستقبل کے لئے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ ایسا مطالعہ جو یاس و ناامیدی کا باعث

ہو مردہ ہے۔ کیونکہ قرآن کے نزدیک مطالعہ تاریخ کا فلسفہ حصول عبرت وہدایت ہے اور اگر وہ مطالعہ جاندار ہو تو اسی میں مستقبل کے لئے حیات بخشی کی ضمانت بھی مضمر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ○

(النمل '۲۷:۶۹)

زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ مجرم اقوام کا انجام کیا ہوتا رہا ہے۔

قرآن خود بھی ایک حیثیت سے انبیاء ماسبق کی تاریخ ہے۔ قرآن نے اپنے اندر سابقہ انبیاء وامم کے حوالے سے تاریخی واقعات کے بیان کئے جانے کا فلسفہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:۔

وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(ھود '۱۱:۱۲۰)

اور یہ جو کچھ ہم آپ پر رسولوں کی خبریں (یعنی تاریخ انبیاء) بیان کرتے ہیں اس سے ہم آپ کا دل مضبوط کرتے ہیں اور اسی میں ہی آپ کو حقیقت سے آگاہی ہوئی اور اہل ایمان کو موعظت ونصیحت یعنی بیداری نصیب ہوئی۔

آیت مذکورہ سے تین اصول مستنبط ہوتے ہیں:۔

○ پہلا یہ کہ اسلام کی تاریخ اہل ایمان کے لئے باعث ایقان وتسکین قلب ہونی چاہئے کہ وہ ان کے لئے سرچشمہ حیات ثابت ہو۔

○ دوسرا یہ کہ اسلام کی تاریخ سے اہل نظر کو حق پر مشتمل ایک ایسا واضح کائناتی اصول اور ضابطہ میسر آنا چاہئے جس کے ذریعے عروج وزوال کی ایک ہمہ گیر توجیہہ ہو سکے۔

○ تیسرا یہ کہ اسلام کی تاریخ سے اہل بصیرت کو مستقبل کے لئے ایسی موعظت ونصیحت اور واضح ہدایت نصیب ہوئی چاہئے۔ جس سے وہ اپنے احیاء وتجدید کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

اگر بنظر غائر جائزہ لیں تو یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ یہ تینوں چیزیں بھی ممکن ہیں اگر تاریخ اسلام کے ہر واقعے سے بالاخر ایک ہی نتیجہ اور ایک ہی اصول اخذ ہو رہا ہو۔ وحدت نتائج کے بغیر علم تاریخ محض بے ضابطہ اتفاقات وحادثات کا مجموعہ قرار پائے گا۔ جس کی کوئی عملی افادیت باقی نہ رہے گی اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ حق کی پیروی سے بالاخر فتح اور حق کی خلاف ورزی سے بالاخر شکست متحقق ہوتی ہے۔ اسی کو فن تاریخ کی اصطلاح میں کائناتی قانون عروج وزوال کہتے ہیں جس کا اعلان قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ
(الاحقاف، ۴۶: ۳۵)

پیغام حق کا پہنچانا یہ ہے کہ کیا حق کی خلاف ورزی کرنے والی قوم کے سوا کسی اور کو بھی تباہ کیا گیا؟ ہرگز نہیں۔

گویا تباہی وہلاکت صرف حق سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ قرآنی تعلیمات میں نتیجہ خیزی کی قطعی ضمانت کا یہ اسلوب خود اس کی حقانیت کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب آج تک اس کا بدل یا مثل پیش نہیں کر سکی۔

۹۔ امیت صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ دعوت اسلام پر برہم ہو کر کفار ومشرکین مکہ نے آپ کو کیا کچھ نہیں کہا وہ کون سا افتراء وبہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر، کاہن اور مجنون کہا، ایذا رسانی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود پورے عالم کفر میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ ہو سکی کہ آپ امی نہیں ہیں اور یہ قرآن آپ کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ گویا آپ پر اتہام کذب کوئی نہیں لگا سکا۔ آج تک مخالفین اسلام میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ حضور علیہ السلام نے اعلان نبوت سے قبل یا بعد کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہو۔ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے ہوں۔ کسی فاضل سے علوم ومعارف، عربی ادب کی فصاحت وبلاغت،

شعر و سخن کے اصول اور حکمت و دانائی کے خزانے حاصل کئے ہوں۔ آنحضرت ﷺ اپنے معاشرے میں امی اور صادق و امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ قرآن جیسے علم و معرفت سے معمور کلام کا آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونا ہی اس کے منزل من اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ربانی ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۴۸)

اور تم نے قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھی تھی اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست یقیناً شک میں مبتلا ہو جاتے۔

پھر اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے:۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (العنکبوت ۲۹:۵۱)

کیا ان لوگوں کے لئے یہی دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔

گویا آپ پر ایسی کتاب کا نازل ہونا اور آپ کا اسے تلاوت کرنا ہی اس وحی کی صداقت و حقانیت کی روشن دلیل ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی مکتب و مدرسہ یا استاد سے پڑھے بغیر زمانہ گزشتہ و آئندہ کے احوال بیان کرے، عقائد صحیح کا مدلل احقاق اور عقائد باطلہ کا قوی ابطال کرے، انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے اصول و ضوابط بیان کرے، اعلیٰ اخلاق اور مذہبی تعلیمات کا پرچار کرے، طبیعی اور مابعد الطبیعی حقائق کا تفصیلی ذکر کرے، سیاست و معاشرت، اقتصاد و معیشت اور تہذیب و ثقافت کے اصولوں کی تعلیم دے اور ان پر کامیابی سے عمل پیرا بھی ہو، صلح و جنگ اور قومی و بین الاقوامی امور سے متعلق قوانین بتائے، حکمت و دانائی، تدبر و بصیرت اور ضابطہ اصلاح احوال پر مبنی اس اعلیٰ فلسفہ حیات کی بات کرے جو ابد الاباد تک قابل عمل اور انقلاب آفریں ہو لیکن پھر بھی اس کا کلام حق تصور نہ کیا جائے تو یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ بلاشک و شبہ نبی اکرم ﷺ کی امیت قرآن کی حقانیت کی بہت بڑی دلیل تھی۔ حضور ﷺ نے امی ہونے کے باوجود ماکان و مایکون کے جمیع علوم خود

رب ذوالجلال سے حاصل کر لئے تھے۔ ارشاد باری تعالٰی ہے:۔

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء، ۴: ۱۱۳)

اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا فرمایا جو آپ نہ جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر بہت بڑا فضل ہے۔

لفظ قرآن کے چوتھے مادہ اشتقاق کے حوالے سے مذکورہ بالا نو قرائن ان داخلی دلائل میں سے چند ایک ہیں۔ باری تعالٰی نے اس مقدس و معظم کتاب کا نام "القرآن" رکھا تاکہ دلائل و شہادات کے طالبوں پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اپنے ہر دعوے کی صحت و صداقت کے ثبوت میں خود اپنے اندر ہی ہزاروں داخلی قرائن رکھتی ہے۔ اسے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے اصلاً کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں۔

اشاریه

القرآن

نمبر شمار	ابتداء الآیات	حوالہ جات	صفحہ
۱	اهدنا الصراط المستقیم	الفاتحہ۱: ۵	۵۶
۲	صراط الذین انعمت علیهم	الفاتحہ۱: ۷	۵۶
۳	هدی للمتقین	البقرہ۲: ۲	۴۱، ۴۳
۴	ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی	البقرہ۲: ۲۳	۷۶
۵	فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار	البقرہ۲: ۲۴	۷۶
۶	یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا	البقرہ۲: ۲۶	۵۱
۷	ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی	البقرہ۲: ۳۶	۴۶
۸	فاما یاتینکم منی هدی فمن تبع	البقرہ۲: ۳۸	۴۶، ۱۰۳، ۱۰۸
۹	وقد کان فریق منهم یسمعون	البقرہ۲: ۷۵	۵۳
۱۰	ولکم فی القصاص حیاة	البقرہ۲: ۱۷۹	۹۰
۱۱	وبینات من الهدی والفرقان	البقرہ۲: ۱۸۰	۱۰۷
۱۲	شهر رمضان الذی انزل فیه القران	البقرہ۲: ۱۸۵	۱۰، ۴۲
۱۳	هن لباس لکم وانتم لباس لهن	البقرہ۲: ۱۸۷	۸۸
۱۴	نسائکم حرث لکم فاتوا حرثکم	البقرہ۲: ۲۲۳	۸۸
۱۵	یتربصن بانفسهن ثلاثة قروء	البقرہ۲: ۲۲۸	۱۳
۱۶	الله ولی الذین امنوا	البقرہ۲: ۲۵۷	۹۰
۱۷	رب ارنی کیف تحی الموتی	البقرہ۲: ۲۶۰	۱۰۱، ۱۰۲
۱۸	ذالک من انباء الغیب نوحیه الیک	ال عمران۳: ۴۴	۹۳

نمبر شمار	ابتداء الآيات	حواله جات	صفحه
١٩	هذا بيان للناس وهدى	آلعمران٣: ١٣٨	٤١
٢٠	ولاتهنوا ولاتحزنوا وانتم الاعلون	آلعمران٣: ١٣٩	١٠٣
٢١	يتلوا عليهم آياته ويزكيهم	آلعمران٣: ١٦٤	٥٩
٢٢	او لامستم النساء	النساء٤: ٤٣	٨٨
٢٣	ومن يطع الله والرسول	النساء٤: ٦٩	٥٦
٢٤	ولو كان من عند غير الله	النساء٤: ٨٢	٨٢
٢٥	وعلمك ما لم تكن تعلم	النساء٤: ١١٣	١٢٢
٢٦	يا ايها الناس قد جاء كم برهان	النساء٤: ١٧٤	٦٧، ٦٨
٢٧	قد جاء كم من الله نور	المائده٥: ١٥–١٦	٦٤
٢٨	لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا	المائده٥: ٤٨	٢٨
٢٩	ومن يتول الله ورسوله	المائده٥: ٥٦	١٠٤
٣٠	بل يداه مبسوطتان ينفق كيف يشاء	المائده٥: ٦٤	٨٨
٣١	مافرطنا فى الكتاب من شيى	الانعام٦: ٣٨	١٤
٣٢	ولارطب ولايابس الا فى كتاب مبين	الانعام٦: ٥٩	١٤
٣٣	وكذالك نرى ابراهيم	الانعام٦: ٧٦	١٠١
٣٤	ان هو الا ذكرى للعالمين	الانعام٦: ٩٠	٤٧
٣٥	انه منزل من ربك بالحق	الانعام٦: ١١٥	٧٢
٣٦	فصلناه على علم هدى	اعراف٧: ٥٢	٤٢

نمبر شمار	ابتداء الآیات	حوالہ جات	صفحہ
۳۷	یاایها الناس انی رسول الله الیکم	اعراف۷: ۱۵۸	۱۰۹
۳۸	فلما تغشاها حملت حملا خفیفا	اعراف۷: ۱۸۹	۸۸
۳۹	ویرید الله ان یحق الحق بکلماته	انفال۸: ۷-۸	۱۱۵
۴۰	لیحق الحق ویبطل الباطل	انفال۸: ۸	۴۵
۴۱	یریدون ان یطفؤا نور الله	التوبه۹: ۳۲	۱۱۵
۴۲	فقد لبثت فیکم عمرا من قبله	یونس۱۰: ۱۶	۶۹
۴۳	یا ایها الناس قد جائتکم	یونس۱۰: ۵۷	۴۲، ۱۰۷
۴۴	ام یقولون افتراه	هود۱۱: ۱۳	۷۶
۴۵	وقیل یارض ابلعی ماءك	هود۱۱: ۴۴	۸۹
۴۶	تلك من انباء الغیب نوحیها الیك	هود۱۱: ۴۹	۹۴
۴۷	وکلا نقص علیك من	هود۱۱: ۱۲۰	۱۱۷، ۱۱۹
۴۸	الر تلك آیات الکتاب المبین	یوسف۱۲: ۱	۶۷
۴۹	انا انزلناه قرآنا عربیا لعلکم تعقلون	یوسف۱۲: ۲	۷۱
۵۰	اوحینا الیك هذا القرآن	یوسف۱۲: ۳	۱۰
۵۱	تصدیق الذی بین یدیه	یوسف۱۲: ۱۱۱	۱۰۶
۵۲	وتفصیل کل شیئ –	یوسف۱۲: ۱۱۱	۱۴، ۴۲، ۱۰۷
۵۳	کتاب انزلناه الیك	ابراهیم۱۴: ۱	۴۵
۵۴	انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون	الحجر۱۵: ۹	۷۸

نمبر شمار	ابتداء الآیات	حوالہ جات	صفحہ
٥٥	فاصدع بما تومر	الحجر ۱۵: ۹٤	۹۰
٥٦	واعبد ربك حتى ياتيك اليقين	الحجر ۱۵: ۹۹	۱۰۲
٥٧	ونزلنا عليك الكتاب تبيانا	النمل ۱٦: ۸۹	۱٤، ٤۳ ۱۰۷
٥۸	وهدى ورحمة وبشرى للمسلمين	النمل ۱٦: ۸۹	۱۰۷
٥۹	ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم	اسراء ۱۷: ۹	۱۰، ٤٥ ۷۲، ۱۰٦
٦۰	وكل شئ فصلناه تفصيلا	اسراء ۱۷: ۱۲	۱٥
٦۱	جاء الحق وزهق الباطل	اسراء ۱۷: ۸۱	٤٥
٦۲	قل لئن اجتمعت الانس والجن	اسراء ۱۷: ۸۸	۷٥
٦۳	اولم يرى الذين كفروا	الانبياء ۲۱: ۳۰-۳٤	۳۲
٦٤	افلم يسيروا فى الارض	الحج ۲۲: ٤٦	۱۱۸
٦٥	مثل نوره كمشكوة فيها مصباح	النور ۲٤: ۳٥	۸۸
٦٦	وعد الله الذين امنوا منكم	النور ۲٤: ٥٥	۹۹
٦۷	ان فى ذالك لاية وما	الشعراء ۲٦: ۸	۸۷
٦۸	وانه لتنزيل رب العالمين	الشعراء ۲٦: ۱۹۲	۷۰
٦۹	نزل به الروح الامين على قلبك	الشعراء ۲٦: ۱۹۳	۷۱
۷۰	تلك آيات القرآن	النمل ۲۷: ۱	۱۰۸
۷۱	قل سيروا فى الارض فانظروا	النمل ۲۷: ٦۹	۱۱۹

نمبر شمار	ابتداء الآيات	حوالہ جات	صفحہ
٧٢	واوحينا الى ام موسى	القصص ٢٨: ٧	٩١
٧٣	وما كنت تتلوا من قبله	العنكبوت ٢٩: ٤٨	١٢١
٧٤	اولم يكفهم انا انزلنا عليك	العنكبوت ٢٩: ٥١	٧٣، ١٢١
٧٥	الم ٥ غلبت الروم	الروم ٣٠: ١–٤	٩٦
٧٦	ولوا نما فى الارض من شجرة	لقمان ٣١: ٢٧	٣٨
٧٧	تنزيل الكتاب لاريب فيه	السجدة ٣٢: ٢	٧٠
٧٨	الله الذى خلق السماوات والارض	السجدة ٣٢: ٤–٩	٣٤
٧٩	لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة	الاحزاب ٣٣: ١٢١	٥٨
٨٠	يايها الناس ان وعد الله حق	فاطر ٣٥: ٥	١١٦
٨١	وان من امة الاخلا فيها نذير	فاطر ٣٥: ٣٤–٢٦	١١٥
٨٢	كل فى فلك يسبحون	ياسين ٣٦: ٤٠	١٩
٨٣	وما علمناه الشعر	ياسين ٣٦: ٦٩	١٠٦
٨٤	ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا	الصافات ٣٧: ١٧١–١٧٣	١٠٤
٨٥	انا انزلنا عليك الكتاب	الزمر ٣٩: ٤١	٤٥
٨٦	قال فبعزتك لاغوينهم اجمعين	الزمر ٣٩: ٨٢	٦٣

نمبر شمار	ابتداء الآیات	حوالہ جات	صفحہ
۸۷	وھمت کل امة برسولھم	المومن۴۰: ۵-۶	۱۰۵
۸۸	وکذلک اوحینا الیک	الشوری۴۲: ۷	۷۱
۸۹	انہ لذکر لک ولقومک	الزخرف۴۳: ۴۴	۴۷
۹۰	ھذا بصائر للناس وھدی	الجاثیہ۴۵: ۲۰	۴۳
۹۱	وسخر لکم ما فی السموات	الجاثیہ۴۵: ۱۳	۲۵
۹۲	بلاغ فھل یھلک الاالقوم الفاسقون	الاحقاف۴۶: ۳۵	۱۲۰
۹۳	امنوا بما نزل علی محمد	محمد۴۷: ۲	۷۲
۹۴	فلاتھنوا وتدعوا الی السلم	محمد۴۷: ۳۵	۱۰۴
۹۵	انا فتحنا لک فتحا مبینا	الفتح۴۸: ۱	۹۸
۹۶	ان الذین یبایعونک	الفتح۴۸: ۱۰	۷۹
۹۷	سیقول المخلفون اذا	الفتح۴۸: ۱۵	۹۸
۹۸	لتدخلن المسجد الحرام	الفتح۴۷: ۲۷	۹۸
۹۹	ولقد یسرنا القرآن للذکر	القمر۵۴: ۱۷	۸۷
۱۰۰	فبای الاء ربکما تکذبان	الرحمن۵۵: ۱۳	۸۷
۱۰۱	مرج البحرین یلتقیان	الرحمن۵۵: ۱۹	۹۳
۱۰۲	فیھما عینان نضاختان	الرحمن۵۵: ۶۶	۹۳
۱۰۳	متکئین علی رفرف	الرحمن۵۵: ۷۶	۹۳
۱۰۴	انہ لقرآن کریم	الواقعہ۵۶: ۷۷	۱۰
۱۰۵	کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی	المجادلہ۵۹: ۲۱	۱۱۳

نمبر شمار	ابتداء الآیات	حوالہ جات	صفحہ
۱۰۶	ھو الذی ارسل رسولہ	الصف۶۱: ۹	۳۷
۱۰۷	کمثل الحمار یحمل اسفارا	الجمعۃ۶۲: ۵	۸۸
۱۰۸	ولن یؤخر اللہ نفسا	المنافقون۶۳: ۱۱	۱۸
۱۰۹	ومن یومن با للہ یھد قلبہ	التغابن۶۴: ۱۱	۴۹
۱۱۰	تکاد تمیز من الغیظ	الملک۶۷: ۸	۹۲
۱۱۱	ن والقلم وما یسطرون	القلم۶۸: ۱	۹۱
۱۱۲	وقدخلقکم اطوارا	نوح۷۱: ۱۴–۲۰	۷۱
۱۱۳	ان ھذا تذکرۃ	المزمل۷۳: ۱۹	۴۷
۱۱۴	ان علینا جمعہ	القیامۃ۷۵: ۱۷	۱۲،۶۴ ۷۸
۱۱۵	والمرسلات عرفا	المرسلات۷۷: ۱–۶	۹۱
۱۱۶	فاذا النجوم طمست	المرسلات۷۷: ۸–۱۲	۹۱
۱۱۷	ویل یومئذ للمکذبین	المرسلات۷۷: ۱۵	۸۷
۱۱۸	وما ھو علی الغیب بضنین	التکویر۸۱: ۲۴	۹۴
۱۱۹	واللیل اذا عسعس والصبح	التکویر۸۱: ۱۷–۱۸	۸۹
۱۲۰	والقمر اذا اتسق	الانشقاق۸۴:	۲۰

نمبر شمار	ابتداء الآیات	حوالہ جات	صفحہ
١٢١	لتركبن طبقا عن طبق	الانشقاق ٨٤: ١٩	٢١
١٢٢	فما لهم لا يؤمنون	الانشقاق ٨٤: ٢٠	٢١، ٢٥
١٢٣	بل هو قرآن مجيد	البروج ٨٥: ٢١	١٠
١٢٤	وجوه يومئذ ناعمة	الغاشيه ٨٨: ٨-١٢	٩٢
١٢٥	اذا دكت الارض دكا دكا	الفجر ٨٩: ٢١	٩٣
١٢٦	والشمس وضحاها ○ والقمر	الشمس ٩١: ١-١٠	٩٢
١٢٧	والضحى ○ والليل	الضحى ٩٣: ١-١١	٨٥
١٢٨	اقراء باسم ربك الذى	العلق ٩٦: ١-٥	٣٠
١٢٩	يتلوا صحفا مطهرة	البينة ٩٨: ٢-٣	٣٨
١٣٠	اذا زلزلت الارض	الزلزال ٩٩: ١-٣	٩٢
١٣١	فاثرن به نقعا	العاديات ١٠٠: ٤-٥	٩٢
١٣٢	انا اعطيناك الكوثر	الكوثر ١٠٨: ١-٣	٨٦

الاحاديث والآثار

اقوال

نمبر شمار	ابتداء الاقوال	صاحب قول	صفحہ
١	فى عرف الشرع على المجموع	مولانا عبد الحق	١٢
٢	ما من شى فهو فى القرآن	علامه ابن برهان	١٥
٣	ما من شيى الا يمكن استخراجه	امام سيوطى	١٥
٤	ما من شيى فى العالم	ابن سراقه	١٦
٥	سلونى عما شئتم اخبركم	امام شافعى	١٦
٦	جمع القرآن علوم	ابن ابى الفضل	١٧
٧	الركوب فى الاصل كون	امام راغب اصفهانى	٢٢
٨	The Conquest of Space	Maurice Bucaille	٢٦
٩	سمى القرآن قرآنا	امام سفيان ثورى	٤٠
١٠	القران الجمع بين الحج	امام راغب اصفهانى	٤٠
١١	انه لايقال للحرف الواحد	امام راغب اصفهانى	٦٤
١٢	القرأة ضم الحروف	امام راغب اصفهانى	٦٤
١٣	محمد الذى كثرت خصاله المحمودة	امام راغب اصفهانى	٦٥
١٤	ومنه محمد كانه حمد مرة	ائمه لغت وادب	٦٥
١٥	محمد هو المستغرق لجميع المحامد	امام بغوى	٦٥
١٦	انما مادته "قرأ" بمعنى	امام زركشى	٦٦
١٧	البرهان اوكد الادلة	امام راغب اصفهانى	٦٩
١٨	البرهان دليل على اقامة الحق	امام خازن	٦٩

اشعار

نمبر شمار	اشعار	شاعر	صفحہ
۱	سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں	اقبالؒ	۲۳
۲	کالبدر من حیث التفت رایتہ یھدی الی عینیک نورا ثاقبا	جلال الدین سیوطیؒ	۳۹
۳	الم تر ان اللہ ارسل عبدہ ببرھانہ واللہ اعلی و امجد	حسان بن ثابتؓ	۶۶
۴	زفرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست	شاہ ولی اللہ دہلویؒ	۷۵
۵	عباراتنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر		۷۵
۶	آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید از وے رو متاب	مولانا رومؒ	۸۲

اعلام

اماکن و بلاد

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / متوفی	مطبع / سن اشاعت
۱	القرآن الکریم	منزل من اللہ	
۲	صحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاری'' ' ۲۵۶ھ	نور محمد اصح المطابع کراچی ' ۱۳۸۱ھ
۳	جامع الترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذی'' ' ۲۷۹ھ	نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
۴	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث'' ' ۲۷۵ھ	مکتبہ مجتبائی لاہور ' ۱۴۰۵ھ
۵	سنن نسائی	امام احمد بن اشعث نسائی'' ' ۳۰۳ھ	نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
۶	مشکوۃ المصابیح	محمد بن عبداللہ تبریزی'' ' ۷۴۲ھ	اصح المطابع دہلی
۷	مناہل العرفان	الشیخ محمد عبدالعظیم الزرقانی''	دار احیاء التراث العربی بیروت
۸	البرہان	علامہ بدرالدین زرکشی'' ' ۷۹۴ھ	دارالفکر بیروت ' ۱۹۸۰ء
۹	تفسیر کبیر	امام فخرالدین رازی'' ' ۶۰۶ھ	دارالفکر بیروت ' ۱۳۹۸ھ
۱۰	تفسیر ابن کثیر	حافظ عماد الدین ابن کثیر'' ' ۷۷۴ھ	ادارہ اندلس بیروت ' ۱۳۸۵ھ
۱۱	تفسیر الکشاف	امام محمود بن عمر زمخشری'' ' ۵۲۸ھ	مطبعہ الاستقامہ قاہرہ ' ۱۹۵۳ء
۱۲	تفسیر الخازن	علامہ علی بن محمد خازن شافعی'' ' ۷۲۵ھ	دارالکتب العربیہ پشاور
۱۳	تفسیر مظہری	قاضی ثناء اللہ پانی پتی'' ' ۱۲۲۵ھ	بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ

نمبر شمار	کتاب	مصنف / متوفی	مطبع / سن اشاعت
۱۴	الاتقان	امام جلال الدین سیوطیؒ، ۹۱۱ھ	سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۰ء
۱۵	قانون التاویل	قاضی ابوبکر الغربیؒ، ۵۴۳ھ	موسسہ علوم القرآن بیروت
۱۶	الفوز الکبیر	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ۱۱۷۶ھ	مدرسہ البنات لاہور
۱۷	المفردات	علامہ راغب اصفہانیؒ، ۵۰۲ھ	المکتبہ المرتضویہ ایران، ۱۳۴۲ھ
۱۸	الوفا باحوال المصطفیٰ	علامہ عبد الرحمان ابن جوزیہؒ، ۵۹۷ھ	مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد، ۱۹۷۷ء
۱۹	الصارم المسلول	امام ابن تیمیہؒ، ۷۲۸ھ	مکتبہ نشر السنہ ملتان
۲۰	*History of Bible*		
۲۱	*The Bibie, The Quran and Science*	*Maurice Bucaille*	
۲۲	*Encyclopeadia Americana*		

ذریعے ہوگا۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔

الركوب في الاصل كون الانسان على ظهر حيوان وقد يستعمل في السفينة (المفردات)

رکوب اصل میں انسان کے کسی حیوان پر سوار ہونے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا استعمال جہاز پر بھی ہوتا ہے۔

لہٰذا اولین ترجیح کے طور پر ہم "لتركبن" کے اصلی اور حقیقی معنی کا استعمال مراد لیں گے۔ مجازاً بلند ہونا مراد نہیں لیں گے کیونکہ بعض اوقات کوئی لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عام حالات میں جب کہ حقیقت مستعملہ ہو، متعذرہ یا مہجورہ نہ ہو تو مجازی معنوں کی طرف التفات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی اس قدر فروغ پذیر نہ ہوئی تھیں کہ انسان زمین سے پرواز کر کے اوپر کسی دوسرے طبق تک پہنچ سکے، اس وقت تک مجازی معنوں کی بنیاد پر ہی آیت کا مفہوم بیان کیا جاتا رہا ہے کیونکہ حقیقی معنی کا اطلاق ممکن نہ تھا۔ لیکن آج جب کہ سائنسی ترقی کے دور میں فضائی حدود میں انسانی پرواز نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو گئی ہے تو لتركبن کا اپنے حقیقی معنی پر اطلاق بلاشک و شبہ جائز ہو گا۔

مزید برآں لتركبن میں لام تاکید اور نون ثقیلہ دونوں اظہار مقصود میں خصوصی تاکید پیدا کر رہی ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ آیت متذکرہ میں بیان ہونے والا واقعہ بہرصورت رونما ہو کر رہے گا کیونکہ یہ ترکیب مستقبل میں صدور فعل پر دلالت کیا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت پیشین گوئی کے اعتبار سے ایک چیلنج کے طور پر نازل کی گئی اور لتركبن کے اعلان سے قبل پے در پے قسموں کا ذکر منکرین قرآن کے لئے اس چیلنج میں مزید شدت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لئے تھا۔ مستزاد یہ کہ لتركبن جمع کا صیغہ ہے اور صیغہ جمع عام طور پر عربی زبان میں کم از کم تین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ لتركبن کے فاعل کم از کم تین افراد ہوں گے جو ایک طبق سے دوسرے تک پرواز کر کے جائیں گے۔ اب پھر آیات اور ان کی ترکیب ملاحظہ کیجئے۔

قرآن قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ "قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ اے